قل للعیون الرمد ایاک ان تری سنا الشمس فاستغشی ظلام اللیالیا

گرد آلود آنکھوں سے کہہ دو کہ اگر وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں تو راتوں کی تاریکیاں اپنے اوپر اوڑھ لیں

مقام حیات

المسمی بہ

مدارک الاذکیاء فی حیاۃ الانبیاء علیہم السلام

یعنی

مکین گنبد خضرا کی حیات برزخی کا بیان

تالیف

علامہ خالد محمود سیالکوٹی

مکتبہ پیام اسلام

اندرون شیرانوالہ گیٹ ● لاہور

کتاب ملنے کے پتے

پاکستان میں

(۱) جناب شفیق احمد صاحب قریشی، نقشبندی، مجددی ۵۵ - رام تلائی سیالکوٹ

(۲) المکتبۃ الحبیبیۃ غلہ منڈی منٹگمری

(۳) مولانا دوست محمد صاحب معرفت مولانا خدا بخش صاحب خطیب جامع مسجد

بیرون دہلی گیٹ - ملتان

(۴) ناظم مکتبہ حنفیہ مسجد گنبد والی - جہلم

(۵) مکتبہ مخزن العلوم متصل عیدگاہ خان پور - ضلع رحیم یار خاں

(۶) مولانا فضل حق صاحب خطیب جامع مسجد گنج منڈی، راولپنڈی

ہندوستان میں

(۱) کتب خانہ امداد الغربا - سہارن پور

(۲) مولانا محمد ازہر شاہ صاحب قیصر شاہ منزل - دیوبند

قل للعیون الرمد ایاک ان تری سنا الشمس واستغشی ظلام اللیالیا

گرد آلود آنکھوں سے کہ دو کہ اگر وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں تو راتوں کی تاریکیاں اپنے اوپر اوڑھ لیں

مقام حیات

المشتہر بہ

مدارک الاذکیاء فی حیاۃ الانبیاء علیہم السلام

یعنی

مکین گنبد خضرا کی حیات برزخی کا بیان

تالیف

علامہ خالد محمود سیالکوٹی

ملنے کا پتہ

مکتبہ پیام اسلام

اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور ۸

ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۸۰ھ

طبع . . . . اول

تعداد . . . . دو ہزار

قیمت قسم اوّل . . -/۹ . . . نو روپے

قیمت قسم دوم . . . . ساڑھے سات روپے

ناشر

ادارہ حفظ معارف اسلامیہ

لاہور

دی کوآپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس لمیٹڈ
وطن بلڈنگ۔ لاہور میں
باہتمام طالب حق منیجر طبع ہوئی

فہرست مضامین

تعارف و اعتذار

اِس نازک دَور میں، جبکہ عوامی سطح پر مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوتی جارہی ہے، تن آسانیاں اَور لذت سامانیاں مذہب سے عام بیزاری پیدا کرنے میں مصروفِ عمل ہیں —— ضرورت تھی کہ احترامِ دین اور فکرِ آخرت رکھنے والا طبقہ —— جیسے کہ عام طور پر دینی طبقہ کہا جاتا ہے —— اپنی مجموعی کوششیں اَور تمام تر جِدّ و جہد —— دین و ملت کے اُصولی مسائل پر مرتکز کر دے، لیکن افسوس کہ جو لوگ احترامِ دین کے احساس میں مشترک تھے، تفاصیلِ فکر و عمل میں خود مختلف راہیں چلنے لگے اَور ؎

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مالی قدروں اَور جنسی لذتوں کا آمیزہ —— اِسلام کو اپنے رستے میں ایک رُکاوٹ سمجھ کر لادینی کے لیے ایک متحدہ محاذ بنا رہا ہے —— زمین کہاں تک ہموار ہو چکی ہے، یہ اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں —— مذہبی راہنماؤں سے مذہب تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا —— تنگ نظر فرقہ پرستوں کو خوش فہمی ہے ؎

ہنوز دہلی دور است!

سوادِ اعظم کے مختلف مسالکِ عمل بے شک ایک ہی جادۂ شریعت کے نظامِ وُسعت اَور ایک ہی چشمۂ عمل کے مختلف کنارے تھے۔ عقائد کی مختلف تعبیرات بھی بلا ریب نزاعِ لفظی کی حدود سے متجاوز نہ تھیں، لیکن افسوس کہ محدود ذہنوں کی تنگ نظری نے انھیں بھی جنگ کے میدان بنا کر سوادِ اعظم کی مرکزی وحدت کو پارہ پارہ

کر دیا۔

اختلاف سے خلاف پیدا ہُوا اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اُصول تو درکنار، فروعات اور تعبیرات پر بھی تعصّب اور تحزّب کی تند ہوائیں چلنے لگیں۔ ایسے حالات میں ہر دردمند اور حسّاس مُسلمان کا دِل تڑپ اُٹھتا ہے اور تڑپنا بھی چاہیے کہ ؎

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

جہاں تک اِس حقیقت کا تعلّق ہے کہ بعض ابواب میں خود شریعت ہی مختلف طریقِ عمل پیش کر کے اسلام کے نظامِ وُسعت کا پتہ دیتی ہے، بے شک ایسے اختلافات رحمت ہیں۔ لیکن بیمار عقلیں اور کمزور ذہن جب اِن اختلافات سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اجماعیات اور مسائلِ متفقہ میں بھی کیڑے نکالنے لگیں، تو کون سا حقیقت آشنا دِل ہے، جو زخمی نہ ہو اور کون سی صداقت پسند آنکھ ہے، جو اشک بار ہوئے بغیر رہ سکے!

اندرونی اتّحاد کی ضرورت جتنی بیرونی حملے کے وقت ہوتی ہے، شاید ہی اُس سے پہلے کبھی محسوس کی گئی ہو۔ ضروری ہوتا ہے کہ داخلی انتشار کے سدِّباب کے لیے جملہ عوامل بروئے کار لائے جائیں —— فطرت کا نظامِ انقلاب اور قومی زِندگی کا مدّوجزر اِس حقیقت کا نہ صرف پتہ دیتے ہیں، بلکہ یقین دِلاتے ہیں کہ وحدتِ ملّی کا مرکز و محور صرف اور صرف اعتماد علی السّلف ہے۔ سلف سے مُراد نسل و وطن کے پیش رو نہیں، بلکہ علم و معرفت کے وہ ستون ہیں جن سے تاریخ کے مختلف ادوار میں علمِ نبوّت —— پوری اُمّت کو وراثت میں ملتا رہا۔ فکر و نظر کی وُسعتیں اُسی حد تک لائقِ تحسین ہیں کہ اعتماد علی السّلف کا دامن ہاتھ سے نہ چھُوٹے اور احساسِ ملّی کا یہ چشمۂ حیات گدلا نہ ہونے پائے ؎

راہِ آبا رَو کہ اِیں جمعیّت است   معنیِ تقلید ضبطِ ملّت است!   (اقبالؒ)

جاننا چاہیے کہ سوادِ اعظم، اہلُ السنّت والجماعت، کا سلف و خلف سے یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم، کو اس دُنیا سے انتقال فرمانے کے بعد عالمِ برزخ میں جو حیات حاصل ہے، وہ اُسی جسدِ اطہر کے ساتھ ہے، جو دُنیا میں آپ کو حاصل تھا اور جسے روضۂ مطہرہ میں دفن کیا گیا تھا۔ قبرِ منوّر کی اس حیاتِ جسمانی کا مدار اس دُنیا کے رزقِ مادّی پر نہیں، بلکہ برزخ کے رزقِ رُوحانی پر ہے۔ حضورؐ کی ایسی حیاتِ برزخی کا، جو باعتبارِ تعلّق بالبدن حیاتِ جسمانی اور باعتبارِ تعلّق بالرّزق حیاتِ رُوحانی ہے، آج تک سلف و خلف سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں، جس نے بھی اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی، اُسے اس متوارث نظریئے کے تسلیم کرنے سے چارہ نہ رہا۔ ——— احناف و شوافع، موالک و حنابلہ، محدّثین و متکلّمین اور فقہاء ائمۂ ہُدیٰ میں سے کسی ایک نامور شخصیت کا بھی ——— باوجود تلاش و تجسّس کے، پتہ نہیں چل سکا، جس کا یہ عقیدہ ہو کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جسدِ اطہر روضۂ منوّرہ میں محض بے جان اور بے حس و بے شعور پڑا ہے اور رُوحِ مبارک کا اس سے کوئی تعلّق نہیں (معاذ اللہ) ——— من ادعی فعلیہ البیان۔

اس میں تو کچھ تھوڑا سا اختلافِ نظر سے گزرا کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مدفون ہونے کے بعد آپ کی روحِ اقدس اعلیٰ علیّین سے لا کر آپ کے جسدِ اطہر میں لوٹا دی گئی تھی یا آپ کی وفاتِ شریفہ کے وقت رُوحِ مبارک قبض ہو کر آپ کے قلبِ منوّر ہی میں ٹھہر چکی تھی، جو بعدِ دفن پھر سارے جسدِ اطہر میں پھیلا دی گئی، یعنی روضۂ منوّرہ کی یہ حیاتِ جسمانی رُوح لوٹانے سے قائم ہوئی یا رُوح پھیلانے سے اس کا استقرار ہوا ———

ہمیں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کیفیتِ حصولِ حیات کیا تھی۔ امرِ واقع خواہ کوئی سی صورت ہو، یہ بہرحال قدرِ مشترک ہے کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم آج اپنے روضۂ شریفہ میں حیاتِ جسمانی سے تشریف فرما ہیں۔

یہ اختلاف بھی نظر سے گزرا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدفون ہونے کے بعد آپ کی روحِ اقدس نے اعلیٰ علیین، رفیقِ اعلیٰ یا حظیرۂ قدسیہ میں استقرار پکڑا اور وہاں سے اُس نے روضۂ منورہ میں پڑے ہوئے جسدِ اطہر پر اپنی شعاعیں ڈالیں اور اس تاثیر سے پھر آپ کے جسدِ اطہر میں حیات لوٹ آئی، یا امرِ واقع یہ تھا کہ روحِ اقدس اس حظیرۂ قدسیہ یا اعلیٰ علیین سے تعلق قائم کرکے پھر قبرِ شریف میں رکھے ہوئے جسدِ اطہر میں لوٹا دی گئی، یعنی روضۂ منورہ کی یہ حیاتِ جسمانی روحِ مبارک لوٹانے سے قائم ہوئی، یا تاثیرِ روح سے اس کا تقوّم ہوا۔ ہمیں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں کہ اس وصولِ حیات کی کیفیت کیا تھی۔ صورتِ واقعہ خواہ کچھ ہو، یہ حقیقت بہر حال قدرِ مشترک ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روضۂ شریفہ میں حیاتِ جسمانی سے تشریف فرما ہیں اور وہ جسدِ اطہر وہی ہے جو اس دنیا میں تھا۔

اگر اختلافات کی حدود یہی رہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روضۂ شریفہ کی حیات ——— کا تقوم جسدِ اطہر میں روحِ مبارک دوبارہ لوٹنے سے ہوا یا روحِ مبارک پھیلانے سے ——— آپ کی یہ حیاتِ جسمانی دخولِ روح سے قائم ہوئی یا تاثیرِ روح سے اس کا تحقق ہوا ——— تو اس میں دخل دینے کی ہمیں چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ یہ وہ مباحث ہیں، جو خود سوادِ اعظم کے مختلف طبقوں میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، نیز جو اختلافات ترتبِ آثار و احکام پر اثر انداز نہ ہوتے ہوں، اُن پر وقت صرف کرنا فکر و نظر کی کوئی خاص خدمت نہیں۔ ان مباحث میں سے خواہ کوئی موقف اختیار کر لیا جائے، اہلِ سنت کا یہ اجماعی نظریہ ہرگز متاثر نہیں ہوتا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ برزخ میں جو حیات حاصل ہے وہ اسی دنیا والے جسدِ اطہر کے ساتھ جسمانی حیات ہے اور اس کا مدار اس دنیا کے رزقِ مادی پر نہیں، بلکہ عالمِ برزخ کے رزقِ روحانی پر ہے۔ دنیوی حیات کے صرف انھی لوازم کو وہاں ثابت مانا جائے گا، جن کے لیے

مستقل دلیل شریعتِ طاہرہ میں موجود ہو، اس لیے کہ اختلافِ دارین متحقق ہے۔

جہاں ہر صحت مند ذہن اس طریقِ عمل کی شدید مذمت کرے گا کہ فروعی اختلافات اور جزوی تعبیرات کو فکر و تنقید اور بحث و تمحیص کی آماج گاہ بنالیا جائے، خصوصاً اس دورِ الحاد میں ——— جبکہ خود مذہب سے ہی تنفر بڑھتا چلا جا رہا ہے اور مالی قدروں کا خمار مذہب کو عہدِ رفتہ کی ایک رسمی یاد سے زیادہ کوئی مقام دینے کے لیے تیار نہیں ——— وہاں اس ضرورت کے تسلیم کرنے سے بھی چارہ نہیں کہ سوادِ اعظم کے اجماعیات کا تحفظ بھی ہر وقت امتحان کی پکار اور ہر تمرّد و الحاد کے سامنے علمائے حق کی للکار رہا ہے۔

حیاتُ النبیؐ کا یہ مسئلہ بھی اپنی ابتدائی سطح میں کوئی اُصولی مسئلہ نہ تھا، لیکن اہلِ سُنّت کے اجماعی نظریے کے پیشِ نظر ایسا بھی نہ تھا کہ اس کی تردید میں احادیثِ شریفہ کے مدلولاتِ صریحہ میں تاویلاتِ رکیکہ، تضعیفِ روایات میں ائمۂ فن کی تجہیل، قواعدِ محدّثین سے استہزاء، شارحینِ حدیث، فقہا اور سلفِ صالحین سے اعتماد اُٹھنے کے صدمے کو آسانی سے برداشت کرلیا جائے یا اعتماد اُٹھانے کی نہایت خطرناک مُہم کو محض اس لیے کہ ابتدائی سطح اُمورِ مہمّہ میں سے نہیں یا یہ مسائل روزمرہ کی زندگی سے متعلق نہیں ——— یُونہی چلنے دیا جائے۔

حیاتُ النبیؐ کے ضمن میں جب "اعتقاد علی السُّنّت" کا اُصولی مسئلہ پامال ہونے لگا تو اس تخمِ حنظل کے برگ و بار بہت دُور دُور تک پھیلتے نظر آئے۔ گُم کردۂ راہ قافلہ ہر مقام پر نیا مؤقف اور ہر طبقے کے سامنے نیا عنوان اختیار کرتا رہا۔

روضۂ منورہ کی حیاتِ جسدی کا انکار اور اس سے متعلقہ مغالطے

جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر روضۂ منورہ

میں محض بے حِس و شعُور پڑا ہے اَور فقط جمادی حیثیت میں ہے، رُوحِ اقدس کا اس سے کوئی تعلق نہیں' اُن کا یہ خیال دراصل اِس نظریّے کا نتیجہ ہے کہ وفات کے بعد ثواب عقاب کا سارا مُعاملہ صِرف رُوح سے ہوتا ہے' بدن یا اجزائے بدن کو اس سے کوئی علاقہ نہیں۔

یہ نظریہ اہلِ سُنّت کے اِس اعتقادی پہلُو سے قطعی طَور پر مُتصادم ہے کہ ثواب عقاب کا مُعاملہ صِرف رُوح ہی سے نہیں' بلکہ قبر میں پڑا ہوا بدن یا اجزائے بدن بھی لذّت والم کا اِدراک کرتے ہیں۔ بنی آدم کی اَرواح' وفات کے بعد' خواہ وُہ علییّن اور سجّین ہی میں استقرار پذیر کیوں نہ ہوں' اُن کا تعلّق اَجسادِ مدفونہ سے ضرور قائم کیا جاتا ہے اَور قبر میں لذّت والم کا اِدراک ضرور ہوتا ہے۔

اِس دُنیا سے عالمِ برزخ میں انتقال کرنے کے بعد رُوح و بدن میں کلّی مُفارقت رہتی ہے؟ یا رُوح و بدن میں کوئی ایسا علاقہ پھر قائم ہو جاتا ہے کہ ہر فوت ہونے والا اپنے اپنے اَعمال اَور اپنے اپنے مقام کے مُطابق اپنے جسد میں الم یا لذّت کا اِدراک کر سکے؟

اوّل الذکر نظریہ معتزلہ و روافض کا ہے۔ وُہ عذابِ قبر کے قائل نہیں۔ اُن کے نزدیک جسدِ مدفون محض جمادی حیثیت رکھتا ہے۔ ثانی الذکر نظریہ اہلِ حق' اہلِ السُّنّۃ والجماعۃ' کا ہے۔ فرقۂ کرامیہ اَور صالحیہ اِس کے قائل ہیں کہ اَجسادِ مدفونہ ہیں تو محض جمادی حیثیت میں، لیکن عذابِ قبر پھر بھی حق ہے۔ یہ تیسرا مَوقف ایک تحکّم اَور سفسطہ[1] ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ حق وُہی ہے، جو اہلِ سُنّت کا نظریہ ہے اَور قرآن و سُنّت کے چشمے اِسی عقیدے کی آبیاری کرتے ہیں۔

---

[1] جوّز بعضهم تعذيب غير الحي ولا شك انه سفسطة (خيالی ص ۱۱۸)
لان الجماد لا حس له فكيف يتصور تعذيبه (حاشیہ مولینا عبدالحکیم سیالکوٹی)

و اعلم ان اهل الحق اتفقوا علیٰ ان اللہ تعالیٰ یخلق فی المیت نوع حیوٰۃ فی القبر قدر ما یتالم ویتلذذ۔[1]

(شرح فقہ اکبر ص۱۲۱)

جان لیجیے سب اہلِ حق اس نظریے پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ میت میں ایک ایسی قسم کی حیات ضرور پیدا فرما دیتے ہیں کہ وہ لذت الم کا ادراک کرتی رہے۔

ایوبی علی الخیالی میں ہے :۔

ان المذاھب فی ھذا المقام ثلثۃ الاوّل المیّت حیّ فی قبرہ فیعذب وھذا مذھب اھل السنّۃ والحق والثانی انہ جماد لا یعذب ولا یدرک العذاب وھذا مذھب جمھور المعتزلہ والروافض والثالث انہ جماد یعذب۔ (ایوبی علی الخیالی ص۱۱۰)

اس مقام پر تین مذاہب ہیں (۱) میت اپنی قبر میں پھر زندہ ہوتی ہے۔ پس عذاب قبر برحق ہے۔ یہ مذہب اہلِ سنّت کا ہے جو اہلِ حق ہیں۔ (۲) میت قبر میں جماد محض ہے۔ پس عذابِ قبر کوئی نہیں۔ یہ مذہب جمہور معتزلہ اور روافض کا ہے۔ (۳) میت قبر میں ہے تو جمادِ محض، لیکن عذابِ قبر پھر بھی ہوتا ہے۔ (یہ مذہب کرامیہ کا ہے)۔

ان نظریات کی روشنی میں اہل السنّۃ کا عقیدہ ہے کہ جب ہر جسد مدفون کو اپنے اپنے مقام کے مطابق کسی نہ کسی طرح کی حیاتِ جسدی حاصل ہوتی ہے، تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے روضۂ مطہرہ میں بہت قوی قسم کی اور نہایت ارفع و اعلیٰ حیاتِ جسمانی کیوں حاصل نہیں۔ انبیاے کرام کے اجسادِ دنیوی کا تحفظ بھی اسی لیے ہے کہ ان پر نہایت قوی قسم کی حیاتِ جسمانی مرتب ہو۔ آں حضرت

---

[1] وکذلک المختار فی الفتاوے الندیریہ جلد۱ ص۲۴۳

صلی اللہ علیہ وسلم، کا مقام جس طرح انتہائی طور پر اعلیٰ ہے، اسی طرح روضۂ اطہر میں آپ کی حیات بھی اپنی رفعت و شان میں نقطۂ انتہا پر ہے۔ روحِ اقدس کا جسدِ اطہر کے ساتھ ایسا قوی تعلق ہے کہ آپ تلذذاً نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روضۂ منورہ پر عرض کیے گئے صلوٰۃ وسلام کو بھی خود سنتے ہیں۔

جسدِ اطہر اور روحِ انور میں کلی مفارقت کا عقیدہ رکھنے والوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ جب ہر میت کو، خواہ اس کا جسم محفوظ ہو خواہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو، یک جا ہو یا اس کے اجزائے بدن منتشر ہو چکے ہوں، روح کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا تعلق ضرور حاصل ہوتا ہے اور جسدِ مدفون یا اجزائے جسد اپنے اپنے مقامات کے مطابق لذت و الم کا ادراک ضرور کرتے ہیں، تو وہ ذواتِ قدسیہ جن کے اجسادِ مطہرہ کا تحفظ خود پروردگار فرما چکا ہو، ان میں ان کے مقامات کے مطابق ارواحِ مطہرہ کی تاثیرات کیوں نہ ہوں گی۔ انبیاء اس اصلِ کلی سے مستثنیٰ کیوں ہوں؟ آخر وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر انبیائے کرام کو اس اصلِ کلی سے نکال کر یہ عقیدہ قائم کیا جا رہا ہے کہ ان کے اجسادِ مدفونہ صرف اکراماً محفوظ ہیں؟ ارواحِ مطہرہ سے انھیں کلی مفارقت ہے۔

اگر کہا جائے کہ ہم اس اصلِ کلی ہی کے قائل نہیں کہ وفات کے بعد روح کا بدن یا اجزائے بدن کے ساتھ کسی نہ کسی درجے کا تعلق ضرور قائم رہتا ہے، تو پھر یہ مسئلہ اور کھل کر سامنے آ جائے گا کہ یہ مذہب اہلِ سنت کا ہے یا معتزلہ و روافض کا۔ اور عذابِ قبر کے متعلق واضح صورت اختیار کرنی ہو گی کہ اس کا اقرار ہے یا انکار۔ اس کے بعد صورتِ مسئلہ اس قابل ہو گی کہ اس پر دلائل پیش کیے جا سکیں۔

خلاصۃ المرام این کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، کے جسدِ اطہر کو روضۂ منورہ میں محض بے حس و بے شعور اور جمادِ مطلق تسلیم کیا جائے، تو یا تو اس پر اس

اصلِ کلی کے درجے کی قوی دلیل قائم کرنا ہوگی کہ انبیاءؑ اس سے مستثنیٰ ہیں اور مستقل دلیل پیش کرنا ہوگی کہ انبیائے کرام اپنے اپنے روضات میں محض بے جان پڑے ہیں --- یا معتزلہ کے اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے ، کہ وفات کے بعد روح و بدن میں کوئی تعلق نہیں ہوتا، کلی مفارقت رہتی ہے وہ ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کے پیشِ نظر یہ اہلِ حق کا نظریہ نہیں -

عقائدِ اہلِ سنت کی سب کتابوں میں عذابِ قبر کے برحق ہونے کی تصریح ہے اور اس عقیدے کو ضروریاتِ اہلِ سنت میں شمار کیا گیا ہے - جو اس کا قائل نہیں، وہ معتزلہ روافض کے موافق اور اہلِ سنت کا مخالف ہے اور اگر بتاویل قائل ہے، تو فرقہ کرامیہ میں سے ہونے میں تو شبہ ہی نہیں -

روضۂ منورہ کی حیاتِ جسدی کے انکار کا دوسرا نتیجہ

کرامیہ کا عقیدہ تھا کہ حضورِ اکرم اپنی وفاتِ شریفہ کے بعد حکمی طور پر نبی اور رسول ہیں، حقیقی اعتبار سے اب آپ نبی نہیں رہے - انعزالِ نبوت کے اس عقیدے کے لیے انھوں نے روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی کو تختۂ مشق بنایا -

کرامیہ کی بنائے استدلال

نبوت کے لیے شعور لازم ہے، علم و احساس کے بغیر اس کا تقوّم نہیں پس جب بھی اس شعور کا انتفا ہوگا، نبوت منتفی ہو جائے گی - آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات پانے کے بعد جب پردۂ قبر میں گئے، تو وہاں احساس و شعور کلی طور پر منتفی ہیں، جسدِ اطہر محض بے جان ہے، صرف اکراماً محفوظ ہے -

روضۂ منورہ میں حیاتِ جسدی کی نفی سے لازم ہے کہ اب آپ نبی نہیں رہے

صرف آپ کی نبوت حکمی طور پر باقی ہے۔

اہلِ سنت کا عقیدہ

علم کلام کے مشہور امام علامہ حسن بن عبدالمحسن المشہور بابی عذبہ فرماتے ہیں :۔

قال ابو حنیفۃ انہ رسول الآن حقیقۃ وقالت الکرامیۃ لا۔

(ص۱۳ طبع حیدرآباد)

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم اب بھی حقیقی طور پر رسول ہیں اور فرقہ کرامیہ والے کہتے ہیں کہ آپ کا رسول ہونا اب حقیقی معنوں میں نہیں۔

ھو صلی اللہ علیہ وسلم بعد موتہ باق علی رسالتہ و نبوتہ حقیقۃ کما یبقی وصف الایمان للمؤمن بعد موتہ وذلک الوصف باق بالروح والجسد معًا لان الجسد لا تاکلہ الارض...... انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ رسولا الی الابد حقیقۃ لا مجازًا۔

(الروضۃ البھیۃ فیما بین الاشاعرۃ والماتریدیۃ ص۱۴)

حضور اکرم اپنی وفات شریفہ کے بعد اب بھی اپنی رسالت اور نبوت پر حقیقی طور پر قائم ہیں۔ جیسا کہ مؤمن اپنی وفات کے بعد بھی صفتِ ایمان سے متصف رہتا ہے اور حضور کا اپنی رسالت پر حقیقی اعتبار سے قائم رہنا روحِ اطہر اور جسدِ انور کے مجموعہ کے ساتھ ہے ...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور ہمیشہ تک کے لیے رسول ہیں حقیقی معنی کے لحاظ سے نہ کہ محض حکمی طور پر۔

کرامیہ نے وفات النبی پر انقطاعِ نبوت کی بنا رکھنے کے لیے روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی کو تختۂ مشق بنایا اور صریح طور پر عقیدہ حیات النبی کا انکار کر دیا اور نہ صرف خود ہی یہ اعتقادِ باطل اپنایا، بلکہ انقطاعِ نبوت کے اس عقیدۂ باطلہ کو امام

اہلِ سُنّت امام ابوالحسن اشعریؒ کی طرف بھی منسوب کر دیا۔

کرامیہ کا مکرو فریب

کرامیہ کا کس قدر فریب ہے کہ اپنے غلط عقائد کی نسبت اکابر اہلِ سُنّت کی طرف کر رہے ہیں۔ حیاتُ النّبیؐ کا انکار اگر ان کا اپنا عقیدہ تھا، تو صاف طور پہ کہتے کہ یہ ہم کرامیہ کا اعتقاد ہے، اسے خواہ مخواہ اہلِ سُنّت کا عقیدہ بتلانا جرم و خیانت کے قطعاً خلاف ہے۔ حیاتُ النّبیؐ کا انکار کرنے والے اس مسلکی التباس کے مرتکب کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ان کے نزدیک ترویجِ دین کے لیے اور اپنے خیالات پھیلانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:۔

ان بعض الکرامیۃ وبعض المتصوفۃ نقل عنھم اباحۃ الوضع فی الترغیب والترھیب وھو خطاء من فاعلہ نشاء عن جھل۔

بے شک بعض کرامیہ سے اور بعض غلط مدعیانِ تصوف سے یہ منقول ہے کہ وہ ترغیب و ترہیب اور وعظ و نصیحت کی خاطر جھوٹ گھڑنا جائز قرار دیتے ہیں اور یہ بہت بڑی غلطی ہے جس کا منشا صرف جہالت ہے۔

(شرح نخبۃ الفکر ص۵۸)

المراد باعتقاد حل الکذب ھو اعتقاد حلہ لمصلحۃ دینہ وترویج مذھبہ۔

(حاشیہ شرح نخبۃ الفکر ص۷۳)

جھوٹ حلال ہونے سے اُن کی مراد یہی ہے کہ اپنے (مزعوم) دین کی خاطر اور اپنے مذہب کو چلانے کے لیے جھوٹ بولنا اعتقادی طور پر حلال ہے۔

فرقۂ کرامیہ کے خصوصی عقائد

۱- بنی آدم کی ارواح وفات کے بعد قبر سے کلی مفارقت میں رہتی ہیں۔ اجساد محض جمادی حیثیت میں رہتے ہیں۔

۲- آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر روضۂ اطہر میں بالکل بے جان اور بے حس و بے شعور ہے۔

۳- اپنے مسلک کی حمایت میں اور اپنے مذہب کی ترویج کے لیے غلط بیانی کرنا جائز ہے۔

۴- آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تو حکماً باقی ہے۔ مگر آپ خود اب نبی اور رسول نہیں رہے (معاذ اللہ)۔

انکارِ حیات کا تاریخی پس منظر

سُلطان طغرل بیگ سلجوقی کے عہدِ حکومت میں نیشاپور کے قریب ایک بہت فتنہ پرداز شخص گزرا ہے۔ اُس کا نام بکندری تھا۔ اور طائف الحیل سے سلجوقی دربار میں منصبِ وزارت پر آگیا تھا۔ اُس کے عقائد اعتزال و رفض کا امتزاج تھے۔

۴۴۵ھ کے قریب اُس نے وفاتِ النبی اور جسدِ جمادی کی تمہید سے انتفائے نبوّت کا عقیدہ اختیار کیا۔ اُس کا اعتقاد تھا کہ حضورؐ کا جسدِ اطہر روضۂ منورہ میں محض بے حس و بے شعور ہے۔ اُس نے اسے انعزالِ نبوت کے لیے کہ حضورؐ وفات شریفہ کے بعد اب حقیقۃً رسول نہیں رہے، ایک سیڑھی بنایا۔ اور نہ صرف یہی، بلکہ

لہ هم فرقة من المشبهة نسبت الی عبداللہ بن کرام و یدعون زیادۃ الورع والتقوی و المعرفۃ التامۃ و مراجع لہ شرح الشرح لعلی القاری علیہ رحمۃ ربہ الباری۔

اِس نظریے کو امام ابوالحسن اشعریؒ کی طرف بھی نسبت کر دیا۔ اقتدار کے سہارے اُس نے اِن خیالات کو بہت دُور تک پہنچانے کی کوشش کی۔

روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی کے انکار سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے جوارِ رسولؐ میں ہونے اور روضۂ اطہر میں ہم پہلو ہونے کی شانِ امتیاز کمزور ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کے رفض کو اِس انکارِ حیات سے کچھ تسکین پہنچتی ہو۔

وفات کے بعد رُوح و بدن کی کُلّی مفارقت سے عذابِ قبر کا انکار بہت قریب الیقین ہو جاتا تھا۔ اس سے اس کے اعتزال کو قوت ملتی تھی۔

یہ عقیدہ کہ اب حضورؐ رسول نہیں رہے، دراصل جزوِ کلمہ محمد رسول اللہ ہی میں تشکیک کی راہ پیدا کرتا تھا۔ حالاں کہ یہ کلمہ بالاجماع صحیح تھا۔

انکارِ حیاتِ قبریہ اور اعتزالِ نبوتِ حقیقیہ کے دونوں باطل عقیدے دوش بدوش چلنے لگے۔ بنائے فاسد علی الفاسد کی لپیٹ میں کتاب و سنت کی بہت سی تصریحات نذرِ تاویلات ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ اہلِ حق اس کے ابطال کی طرف متوجہ ہوئے، اکابرِ اہلِ سنت نے اِن نظریات پر نکیر کی اور امامِ اہلِ سنت امام ابوالحسن اشعریؒ پر جو افتراءات باندھے گئے تھے کہ ان کے عقائد بھی یہی تھے، ان تمام الزامات کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں۔

اُس وقت امامِ حدیث احمد بن الحسین البیہقیؒ (متوفی ۴۵۸ھ) زندہ تھے۔ آپؒ نے اور امام ابوالقاسم عبدالکریم القشیریؒ نے نہایت قوت اور ثابت قدمی سے کرامیہ کا تعاقب کیا۔ یہ سارے مفاسد جس بنیاد پہ قائم کیے جا رہے تھے، وہ یہی تھی کہ حضورؐ اب اپنی قبر میں محض بے جان ہیں (معاذ اللہ)۔ اِن بزرگوںؒ نے یہ جڑ ہی اکھاڑ کر رکھ دی اور بتایا کہ حقیقتِ حال اور قرآن و سنت کا استدلال کیا ہے۔ امام بیہقیؒ نے رسالہ "حیات الانبیاءؑ" لکھا اور علامہ قشیریؒ نے "شکایۃ اہل السنۃ بما نالھم

من المحنۃ" میں ان افتراءات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے حافظ ابنِ عساکر کی کتاب "تبیین کذب المفتری" اور "طبقات الشافعیۃ" زیرِ ترجمۂ امام ابو الحسن الاشعریؒ ملاحظہ کیجیے۔ علامہ تاج الدین سبکیؒ لکھتے ہیں:۔

فان قیل فمن این وقعت هذه المسئلة ان لم یکن لها اصل قیل ان بعض الکرامیة ملأ الله تعالی قبره نارا وظنی ان الله قد فعل الزم بعض اصحابنا ... الخ (طبقات الشافعیه جلد۲ ص۲۵۳)

اگر کہا جائے کہ جب اس مسئلے کی کوئی اصل نہیں، تو پھر یہ کہاں سے آ گیا، تو جواب میں کہا جائے گا کہ بعض کرامیہ نے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو آگ سے بھرے اور میرا گمان یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھر دیا ہوگا، سب سے پہلے یہ مسئلہ گھڑا تھا۔

امامِ حدیثؒ کے اس جلال اور ناراضگی کو دیکھیے اور اس پر غور کیجیے۔ علامہ قشیریؒ فرماتے ہیں:۔

فاما ما حکی عنه (ای الاشعریؒ) وعن اصحابه انهم یقولون ان محمدا صلی الله علیه وسلم لیس بنبی فی قبره ولا رسول بعد موته فبهتان عظیم وکذب محض لم ینطق احد منهم ولا سمع فی مجلس مناظرة ذالك عنهم ولا وجد فی کتاب لهم وکیف یصح ذالك وعندهم محمد صلی الله

ہاں جو امام ابو الحسن اشعریؒ اور دوسرے اشاعرہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک حضورؐ اپنی وفات شریفہ کے بعد اب اپنی قبر شریف میں نبی اور رسول نہیں رہے، یہ محض جھوٹ اور بہتانِ عظیم ہے۔ اشاعرہ میں سے یہ کسی نے نہیں کہا، نہ ان سے کسی مجلس مناظرہ میں ایسی بات سنی گئی اور نہ ان کی کسی کتاب میں یہ مضمون ملا ہے اور ان کا یہ عقیدہ کیسے ہو سکتا ہے

عليه وسلّم حي في قبره۔
(شکایة اهل السنة وطبقات جلد ۲ صـ ۲۰۹)

جبکہ اُن کے ہاں حضورِ اکرمؐ اپنے روضۂ اطہر میں زندہ ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:۔

واما ما نسب الی الامام الاشعریؒ امام اهل السنة والجماعة من انکار ثبوتها بعد الموت فهو افتراء وبهتان والمصرّح به فی کتبه وکتب اصحابه خلاف ما نسب الیه بعض اعدائه لان الانبیاء علیهم الصلٰوة والسلام احیاء فی قبورهم۔
(شامی جلد ۳ صـ ۳۶۶ ـ باب المغنم)

امامِ اہلِ سنّت امام ابوالحسن الاشعریؒ کی طرف جو منسوب کیا گیا ہے کہ وہ حضورؐ کے لیے وفاتِ شریفہ کے بعد اس وصف کے ثابت ہونے کا انکار کرتے ہیں، یہ محض افترا اور بہتان ہے۔ ان کی اور ان کے ہم مشرب احباب کی کتابوں میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے۔ یہ ان کے دشمنوں نے ان کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ انبیا علیہم السّلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

ان نسبة الخلاف فی هذه المسئلة الی الشیخ ابی الحسن الاشعریؒ زورٌ وبهتانٌ انما وقع بسبب ان بعض الکرامیة ..... ان الاشعریؒ واصحابه قائلون بانّ النبی صلّی الله علیه وسلّم فی القبر حیّ یحسّ ویعلم۔
(الروضة البهیة فیما بین الاشاعرة والماتریدیة صـ ۱۵)

امام ابوالحسن اشعریؒ کی طرف اس عقیدے کی مخالفت کی نسبت محض افتراء و بہتان ہے[1] اور اس کا سبب کرامیہ تھے۔ امام اشعریؒ اور ان کے سب اصحاب تو اسی بات کے قائل ہیں کہ حضورِ انور اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور علم و احساس بھی رکھتے ہیں۔

---

[1] اکابر کی طرف انکارِ حیات کی نسبت کرنا کوئی نیا افتراء بہتان نہیں۔ یہ سنت کرامیہ سے چلی آرہی ہے۔ دیکھئے باوِل ضرورة کسرت فی الاسلام۔

ان ائمہ و اکابر کے اندازِ بیان کو دیکھیے اور غور فرمائیے کہ یہ مسئلہ اگر کوئی معمولی مسئلہ ہوتا، تو یہ اکابر و اعیان اتنی سی بات پر اس قدر جلال میں نہ آجاتے۔ حیات النبی کا انکار دراصل بہت سے فتن و مفاسد کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا اور ان ائمہ فن کی ان پر پوری نگاہ تھی۔ اندریں صورت یہ مسئلہ ایک اصولی مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے۔ قصیدہ "بدء الامالی" میں ہے:۔

وان الانبیاء لفی امان
عن العصیان فصلاً وانعزال

امام ملا علی قاریؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

"المعنی ان الانبیاء لفی امان عن العزل عن مرتبۃ النبوۃ والرسالۃ وحکی شارح الطوالع فیہ اجماع الامۃ۔" (ص ۳۵ مطبع مجتبائی)

الغرض یہ وہ امور ہیں جنھوں نے ایک ایسے مسئلے کو جو اپنی ابتدائی سطح میں یقیناً درجۂ ضروریات میں سے نہ تھا، بقائے نبوت پیغمبرِ خاتم، شانِ شیخین بجوارِ رسول الثقلین، اعتماد علی السلف، تحفظِ مسلکِ اہلِ سنت، ازالۂ اوہام کرامیت، حقیقتِ عذاب القبر، احترامِ اجماعِ امت اور آدابِ زیارت جیسے اہم مسائل کی پامالی کی وجہ سے وہ اہمیت دے دی ہے کہ حقیقتِ حال کو جاننا اور صورتِ مسئلہ کو پہچاننا ضروری سمجھا۔ ان حالات اور ضروریات سے متاثر ہو کر کہ مبادا راہ گم کردہ قافلہ مسلکِ اہلِ سنت ہی کو ملتبس کر دے اور جوہرِ وحدت سے ہاتھ دھو کر محض تفرد ہی نہیں، اپنے عوام کے لیے خسارہ تشتت اور ذہنی آوارگی کا موجب ہوں۔ یہ سطور پیشِ خدمت ہیں۔ ممکن ہے یہ ناچیز کوشش اہلِ مذہب کے لیے شفا قلب کا سامان، راہ گم کردہ دوستوں کے لیے منزل کا نشان اور اہلِ یقین کے لیے وضوح و برہان ثابت ہو۔

مقدمہ

قرآن و سُنّت، اسلامی فکر و نظر کا سرچشمۂ حیات ہیں۔ قرآنِ پاک کی بلاغت اس انتہا پہ ملتی ہے کہ طوقِ بشر اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔ بلاغت کا تقاضا اور ادب کی شان یہ ہے کہ ہر بیان اپنے مفہوم میں کچھ سیاق و سباق، کچھ اندازِ تخاطب اور کچھ قرائن کی وضاحت چاہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان اُمور میں علمی افکار اور نظری مقدمات عوامی سطح پر نہیں آ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اصُولی مسائل کے ماسوا اکابر ہمیشہ سُنّت سے استدلال کرتے رہے ہیں۔ اسی میں انھیں عمل کی سلامتی نظر آئی اور اسی سے ان نظریات کی تفصیل ہوئی، جن میں قرآن کا بیان درجۂ اجمال یا درجۂ احتمال میں تھا۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک روایت کیا ہے کہ ترجمان القرآن سیدنا حضرت ابنِ عباسؓ جب دوسری مرتبہ خوارج سے مناظرہ کرنے کے لیے گئے، تو حضرت علیؓ نے انھیں یُوں نصیحت فرمائی:-

"قرآن سے خطاب نہ کرنا (کہ یہاں ارشادِ باری کو دُوسرے معنی پہنانے کی کوشش کی جائے گی)، بلکہ استدلال کی بُنیاد سُنّت پر رکھنا کہ یہاں انھیں مخلص نہ مل سکے گا۔"

آپ نے بارہا محسُوس کیا ہو گا کہ دینی فتنوں کا سرمایۂ حیات پہلے یہی ہوتا ہے کہ سُنّتِ پیغمبرؐ اور تشریحاتِ سلف سے بالکل بے نیاز کر کے بالاستقلال قرآن کی دعوت دی جائے۔ اب یہاں اپنا میدان ہے، جو چاہو وہ معنی کر لو۔ قرآنِ پاک کو اس کی پُوری عظمتِ علمی سے سمجھنے والے ارباب خبرت اگر یاتوں میں نہیں آئیں گے، تو کوئی

حرج نہیں۔ اکثریّت تو عوام کی ہے، انہیں قرآن کے دل کش اور حسین عنوان کے ساتھ مغالطے میں ڈالنا کوئی بات نہیں۔ انکارِ حدیث کی اگر جرأت نہ ہو تو عوامی سطح پر اسے قرآن سے ٹکرا دیا جائے اور پھر اس عنوان سے اس کا انکار کر دیا جائے کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو اُسے ہرگز نہ مانا جائے، پھر کون ہے جو آڑے آسکے۔ عوام میں اتنی استعداد کہاں کہ وہ بشرطِ صحتِ روایت اس ٹکراؤ کو تطبیق و توفیق کے دائرہ میں اُتار سکیں ـــــ حکمتِ قرآن کا یہ دِل کش نعرہ مُدتوں سے ـــــ پُرانے فتنوں کو کم کرنے کے پروگرام کے ساتھ ـــــ نت نئے فتنوں کو جنم دیتا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ کا کاروانِ حیات ایسی کتنی مراحل کے پاس سے گزرا ہے، جن کی نشان دہی اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے

ہاں اسی رہ گزر سے شام و سحر
اجنبی قافلے بھی گزرے ہیں!

خوارج کے متعلق حضور نے اِنھی الفاظ میں پیش گوئی فرمائی :-

یخرج فی ھذہ الأمة قوم تحقرون صلوٰتکم مع صلوٰتھم یقرء ون القرآن لایجاوز حناجرھم یمرقون من الدین کمروق السھم من الرمیة۔	اِس اُمّت سے کچھ ایسے لوگ بھی اُٹھیں گے کہ تم اپنی نمازوں کو اُن کی نمازوں کے آگے ہیچ سمجھو گے، وہ قرآن قرآن پکارتے ہوں گے لیکن وہ اُن کے گلوں ہی تک ہوگا۔ یہ لوگ حقیقی دین سے اِس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔

(رواہ البخاری عن ابی سعید جلد ۲ ص ۱۰۲۴)

قرآنِ پاک اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفاتِ شریفہ

قرآنِ پاک آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اِس دُنیا کی زندگی ہی میں مکمل ہو چکا تھا۔ آپ عالمِ برزخ میں انتقال فرمانے سے پہلے متعدد اجزا اور منتشر اوراق میں یہ امانت اُمت کو سپرد کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ اِس میں آپ کے وقوعِ وفات کی خبر نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ پاک میں آپ کی وفات کا اِمکان (أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ) یا پیش گوئی (اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ) تو ہے، لیکن اِس بات کا بیان کہ آپ پر موت کا وُرود ہو چکا ہے، اِس کا قرآن میں نہ تذکرہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

حضرتِ مسیحؑ کی وفات کے متعلق نصاریٰ کا جو تصوّر ہے، یہ پورا واقعہ صحیب بائبل میں موجود ہے۔ اِس کا بائبل میں مذکور ہونا ہی اِس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہ بائبل وہ انجیلِ مقدس نہیں، جو حضرت عیسیٰؑ کو دی گئی تھی اور جس کی تبلیغ آپ اپنی قوم کو کرتے رہے۔

آں حضرتؐ پر وفاتِ شریفہ کا یقیناً وُرود ہوا اور آپ نے یقیناً اِس دُنیا میں انتقال فرمایا، لیکن قرآنِ پاک اِس وقوعِ موت کی ہرگز خبر نہیں دیتا۔ آپ کی وفاتِ شریفہ کا سب سے پہلا ثبوت حضرت صدیقِ اکبرؓ کا وہ خطبۂ بلیغہ ہے، جو کُتبِ حدیث میں اسانیدِ صحیحہ سے منقول چلا آرہا ہے۔

وقوعِ موت ثابت کرنے کے لیے خواہ مخواہ قرآنی آیات پڑھتے چلے جانا، امکان کو وقوع قرار دینا اور پیش گوئیوں کا تحقّق وقتِ پیش گوئی سے ثابت ماننے چلے آنا، معلوم نہیں، کون سا علمی مقام اور کون سا طریقِ بُرہان ہے، بالخصوص جبکہ یہ کوئی مبحث اور محلِ نزاع نہ ہو، بلکہ وقوعِ وفات پر بنا بر خبرِ مستفیض سب کا اجماع اور اتفاق ہو۔ واضح رہے کہ قرآنِ پاک آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر وُرودِ موت ہو چکنے کی خبر سے بالکل

خاموش ہے۔ آنسے والی موت کے بعد پھر حیات حاصل ہوگی یا قیامت تک جسدِ عنصر اور روح انور میں کُلّی مفارقت رہے گی، اس پر بھی قرآنِ پاک کی کوئی عبارت النص موجود نہیں۔ اب خواہ مخواہ اقتضاء النص سے بھی کمزور سہارے لے کر آیات پر آیات پڑھتے چلے جانا، جزئیات کو کلیات بناتے چلے آنا اور جزئی اشارات سے کھینچ کھینچ کر مطالب کا جال پھیلانا، یہ ایک ایسی حرکت ہے کہ کوئی صاحبِ علم بھی اس بے راہ روی کی تائید نہیں کرے گا اور اس مرضِ مزمن پر جتنے آنسو بہائے جائیں، کم ہیں۔

ہاں، شہداء کے لیے حیات بعد الوفات کا ثبوت یقیناً قرآن میں موجود ہے، جسے انبیاء کی حیات بعد الوفات کے لیے دلالۃ النص کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے مگر ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔ جس طرح وقوعِ وفات کی خبر کتبِ حدیث سے ملتی ہے اسی طرح حیات بعد الوفات کے لیے بھی احادیثِ صحیحہ یقیناً موجود ہیں۔

اثباتِ عقائد کے لیے دلائلِ ظنیہ سے استشہاد ایسا کیوں؟

ممکن ہے کوئی صاحب یہاں یہ اعتراض کر دیں کہ اخبارِ احاد اور سلسلۂ روایات سے یہ مسئلہ کیوں ثابت کیا جائے۔ عقائد ثابت کرنے کے لیے تو دلائلِ قطعیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

جواباً عرض ہے کہ یقین کا فائدہ اور قطعیت صرف قرآنِ پاک اور خبرِ متواتر الاسناد ہی پر منحصر نہیں، بلکہ اخبارِ احاد بھی، جو اپنی اپنی جگہ خواہ متفرق ہی سہی، کسی قدرِ مشترک میں متحد ہو جائیں، تو ایسے یقین کا فائدہ دے سکتی ہیں کہ اس پر عقیدے کی بنیاد رکھی جاسکے۔ پھر جب داخلی اور خارجی قرائن اور مختلف طبقوں کے اہلِ حق کا اجماع اس کے

حقیقتِ مسلّمہ ہونے کی شہادت دے دیں، تو یہ بُنیادِ یقین اور بھی مستحکم ہو جاتی ہے۔

حضرتِ علّامہ شاطبیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وانما الادلة المعتبرة ههنا المستقرأة من جملة ادلة ظنية تضافرت على معنى واحد حتى افادت فيه القطع فان للاجتماع من القوة ما ليس للافتراق ولاجله افاد التواتر القطع وهذا نوع منه فاذا حصل من استقراء ادلة المسئلة مجموع يفيد العلم فهو الدليل المطلوب وهو شبيه بالتواتر المعنوى

(الموافقات جلد ۱ ص ۳۶)

عام طور پر جو دلائل یہاں معتبر ہیں، وہ اس قسم کے ہیں، جو علیحدہ علیحدہ اگرچہ ظنّی ہوں۔ مگر کسی ایک قدرِ مشترک پر سب متفق ہو جانے کی وجہ سے خاص اس مسئلہ میں یقین کا فائدہ دینے لگتے ہیں۔ دلائل کے اِس اشتراک کے بعد مسئلے میں جو قوّت پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں ہو سکتی۔ خبرِ متواتر بھی اسی اجتماعی قوّت کی وجہ سے یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ پس جب کسی ایک مسئلے کے لیے متفرق دلائل جمع ہو جائیں، تو اُن کے مجموع سے (اِس قدرِ مشترک کے لیے) ایک یقین حاصل ہو جاتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کا تواترِ معنوی ہی ہے۔

عذابِ قبر کا برحق ہونا عقائدِ اہلِ سُنّت میں اسی اصل کے ماتحت ہے۔ قرآنِ پاک کی جس آیتِ شریفہ میں اس کا بیان ملتا ہے، وہ قطعی الثبوت ہونے کے باوجود قطعی الدلالت نہیں اور جو احادیث اس مضمون پر قطعی دلالت کرتی ہیں، وہ اپنے ثبوت میں ظنّی ہیں۔ بایں ہمہ عذابِ قبر کو برحق ماننا عقائد میں داخل ہے۔ مُلّا علی قاریؒ نے عذابِ قبر کے داخلِ عقائد ہونے میں یہی استدلال پیش کیا ہے:۔

فلا يخفى ان المعتمد في العقائد هو الادلة اليقينية واحاديث الآحاد لو ثبتت انما تكون ظنية اللهم الا اذا تعدد طرقه بحيث صار متواترًا معنويًا فحينئذٍ قد يكون قطعيًا۔

یہ بات مخفی نہ رہے کہ عقائد کے باب میں دلائل یقینیہ ہی معتبر ہیں۔ اخبار احاد اگر ثابت بھی ہوں، تو بھی ظنی ہیں۔ ہاں، اگر (ایک ہی مضمون) متعدد طریقوں سے اس طرح مروی ہو کہ تواترِ معنوی پیدا ہو جائے، تو اس وقت یہ (قدر مشترک) بھی قطعی اور یقینی ہو جاتی ہے۔

(شرح فقہ اکبر ص۱۲۲)

ہاں اس صورت میں (اگر مسئلہ نظری ہو تو) بقول شاہ صاحبؒ منکر پر قولِ کفر لازم نہیں آتا اور زیادہ سے زیادہ یہی شک کا فائدہ ہے جو اسے مل سکتا ہے۔

والتفصیل فی العرف الشذی ص۳۴ و ص۳۵۵

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

قرآنِ عزیز کا موتِ انسانی کے بارے میں نظریہ

ذہنِ جاہلیت سے مفہومِ موت پر اختلاف

عربوں کا تصور "موت" کے متعلق یہی چلا آ رہا تھا کہ:۔

۱۔ یہ فقط روح کے بدن سے جدا ہونے کا نام ہے اور ایک امر عدمی ہے۔

۲۔ ان کے اعتقاد میں نہ بقائے جسد تھی نہ بقائے روح۔

۳۔ وُرُود موت کے بعد پھر روح اور اس جسدِ دنیوی کا اجتماع ان کے نزدیک محال اور ایک امر مستبعد تھا۔

قرآنِ عزیز نے مفہوم "موت" پر ذہن جاہلیت بدل ڈالا۔ ان لوگوں نے اپنے

فکر و نظر کے مطابق "موت" کے لیے کئی لفظ اختیار کر رکھے تھے۔ علامہ ابن سیدۃ اندلسیؒ نے "المخصص" میں ایک فہرست پیش کی ہے اور ہر لفظ پر اشعارِ جاہلیت سے استدلال کیا ہے۔

اسمائے موت :-

الهميغ والنيط والرهر والمنون والشعوب والفود و الحمام والسام والمقدار وقتيم وجبار وحلاق والقاضية و الطلاطل والطلاطلة والعول والذام والكفت والجداع والحوزة والحتف والخالج ..... وغيرها (المخصص جلد ۲ صـ۱۱۵)۔

انھی میں لفظ "توفی" بھی آیا ہے لیکن اس پر محققِ اندلسیؒ نے اشعارِ عرب سے استناد نہیں کیا۔ بلکہ استدلال میں قرآنِ عزیز کو پیش کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مفہومِ موت پر نزولِ قرآن کے وقت ہی سے ذہنِ جاہلیت سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

"جاہلیت کے اعتقاد میں موت پر "توفی" کا اطلاق درست نہ تھا، کیونکہ ان کے اعتقاد میں نہ بقائے جسد تھی نہ بقائے روح "توفی" وصول کرنے کو کہتے ہیں۔ اُن کے عقیدے میں موت "توفی" نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ مجید نے موت پر "توفی" کا اطلاق کیا اور بتلایا کہ موت سے وصول یابی ہوتی ہے نہ فنا محض۔ اس حقیقت کو ایک کلمہ سے عیاں کر دیا اور کہیں اس لفظ کا اطلاق اپنے اصلی معنی سے جسد مع الروح کے وصول کرنے پر کیا"۔

(مقدمہ مشکلات القرآن صـ۶۷)

عربوں کے تصورِ موت کو جب اسلام کے قرنِ اوّل ہی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تو اب موت سے متعلقہ مباحث پر معنیِ موت کے لیے کلامِ عرب کا مطالبہ ہم نہیں سمجھتے کہ کون سی شانِ تحقیق ہے، حالاں کہ یہاں بھی صرف "ابانۃ الروح عن الجسد" کا نام موت نہیں بلکہ قوّتِ حیوانیہ کے زوال یعنی آثارِ حیات کے سلب ہونے کو بھی موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ علّامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ فعبارة عن زوال القوّة الحيوانيّة وابانة الروح عن الجسد۔

"ہر جان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔" پس موت سے مراد (۱) حیات کی قوّت زائل ہونا اور (۲) رُوح کا جسد سے جُدا ہونا ہے۔

(المفردات ص ۴۹۴)

عرب اُس وقت بھی لفظ "موت" استعمال کرتے تھے۔ جب کوئی اُونٹ کے کجاوے پر گہری نیند میں چلا جائے، اگرچہ اس وقت رُوح جدا نہ ہوتی تھی، لیکن قوّتِ حیوانیہ میں روک پیدا ہو جاتی تھی۔

موت پر قبضِ رُوح کا اطلاق بتلاتا ہے کہ رُوح کے روک لینے کو بھی موت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قبض بطنہ کے معنی امسک بطنہ کے آتے ہیں۔

ہمیں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہر طرف کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن اس بنیادِ یقین کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں کہ ذہنِ جاہلیت سے مفہومِ موت پر اختلاف بالکل ابتدائے اسلام ہی میں ہو گیا تھا۔

نظریۂ قرآن میں موت کیا ہے؟

موت ایک ایسی صفت ہے، جو صفتِ "حیات" کے تغیّر پر بدن کو عارض

ہوتی ہے۔ یہ فقط رُوح کے بدن سے جدا ہونے کا نام نہیں، بلکہ ایک وُجودی شے ہے۔ جس کی اپنی تخلیق ہے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ ط (پ ۲۹) — اللہ تعالیٰ نے موت کو بھی پیدا کیا اور حیات کو بھی۔

پس جب موت کی ایک اپنی خلقت ہے، تو اُسے محض رُوح و بدن کی مفارقت سے تعبیر کرنا اور محض ایک امر عدمی قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

امام ناصر الدین احمد بن محمد بن المنیر الاسکندری المالکی متوفیٰ ۶۸۳ھ فرماتے ہیں:۔

ان الموت عدم وهو خطاء صراح و معتقد اهل السنة انه امر وجودی يضاد الحياة وكيف يكون العدم بهذه المثابة ولو كان العدم مخلوقا حادثا وعدم الحوادث مقررا ازلا للزم قطع الحوادث۔۔

موت کو محض ایک عدمی شے قرار دینا ایک کھلی ہوئی خطا ہے۔ اہلِ سنت کے عقیدے میں وہ ایک امرِ وُجودی ہے، جو حیات کے مقابل ہے۔ عدمی شے اِس درجے میں نہیں ہو سکتی۔ اگر عدم حیات کی بھی خلقت ہوتی ہو اور وہ حادث ہوں اور عدمِ حوادث کا تقرر بھی ازلی ہو تو اِس سے قطعِ حوادث لازم آتا ہے۔

(الانتصاف جلد ۳ صفحہ ۲۰۳ مصر)

رُوح المعانی میں ہے:۔

والموت على ما ذهب الكثير من اهل السنة صفة وجودية تضاد الحياة واستدل على وجوديته

جمہورِ اہلِ سنت کے نزدیک موت ایک صفتِ وُجودی ہے، جو حیات کے مقابل ہے۔ اور اُس کے وُجودی ہونے کا استدلال اس کے فعلِ خلق سے متعلق ہونے سے ہوتا ہے

بتعلق الخلق به وھو لا یتعلق بالعدمی لانہ لیّۃ الاعدام۔

کیونکہ فعلِ خلق عدمی چیزوں سے متعلق نہیں ہوتا۔ عدمیات تو ازلی ہیں۔

(ج ۲۹ ص۱۴ مصر)

امام رازیؒ لکھتے ہیں:۔

واختلفوا فی الموت فقال قوم انہ عبارۃ عن عدم ھذہ الصفۃ و قال اصحابنا انہ صفۃ وجودیۃ مضادۃ للحیاۃ واحتجوا علی قولھم بانہ تعالیٰ قال الذی خلق الموت والحیاۃ والعدم لایکون مخلوقا ھذا ھو التحقیق (جلد ۸ صنہ۱۷) والموت عند اصحابنا صفۃ وجودیۃ مضادۃ للحیاۃ۔

مفہومِ موت پر پرانا اختلاف چلا آرہا ہے، بعض اسے عدمِ حیات سے تعبیر کرتے ہیں اور ہمارے اصحاب (اہلِ سُنّت) اس بات کے قائل ہیں کہ وہ (موت) ایک صفتِ وجودی ہے جو حیات کے مقابل ہے۔ اکابرِ اہلِ سُنّت کا استدلال اس ارشادِ قرآنی سے ہے "خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاتَ"، کیونکہ عدمیات کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تحقیق یہی ہے کہ موت کوئی عدمی صفت نہیں، بلکہ ایک صفتِ وُجُودی ہے۔

(تفسیر ابی السعود ص۱۹۳)

اگر موت عدم کا نام ہو، تو خلق کا فعل کس چیز پر واقع ہوگا! فتفکر وتدبر۔

حقیقتِ موت

بہرحال موت ایک ایسی صفت ہے جو صفتِ حیات کے تغیر پر بدن کو لاحق ہوتی ہے۔ اگر صفتِ حیات اپنے موصوف کے حق میں صفتِ عرضی ہے، تو اُس کے زوال پر موت کا وُرُود ہوتا ہے اور اگر صفتِ حیات اپنے موصوف کے

حق میں ذاتی ہو تو پھر دو صورتوں سے خالی نہیں، قابلِ تغیّر ہے (جس کا پتہ یہیں اِس سے چل سکتا ہے کہ اس کی کیفیت میں پہلے بھی کبھی ظہور و خفا کا اِنقلاب آیا ہو) یا ناقابلِ تغیّر۔ اگر قابلِ تغیّر ہے تو پھر صفتِ حیات کے معرضِ خفا میں آنے یا مستور ہونے پر یہ صفتِ موت بدن کو لاحق ہوگی اور اگر ناقابلِ تغیّر ہے تو پھر اس پر ورُودِ موت محال ہے پھر وہ حیاتِ دائمہ ازلیہ ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب!

خیر اتنی تدقیق میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جمہور اہلِ سُنّت مفہومِ موت کی اتنی گہرائی میں نہیں گئے۔ ایسی حیاتِ ذاتی، جس کی کیفیات ظہور و خفا میں قابلِ تغیّر ہوں اور اُس کی ذاتیت بھی اضافی ہو، ازلی نہ ہو، اس کا مرکز و مصداق پوری کائنات میں ایک ہی ذات تھی، جو باعثِ تکوینِ عالم اور خلاصۂ کائنات تھی۔ اس لیے اِنسانیات کی دُنیا میں مفہومِ موت کا یہ پہلو اتنا شائع و ذائع نہ ہو سکا۔ اگر موت کو اسی عام معنی میں لے لیا جائے کہ موت رُوح کے بدن سے جُدا ہونے کو کہتے ہیں تو عوامی سطح پر اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اِس تفصیل سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ اِن باریک حقائق میں اُلجھنا اور خواہ مخواہ کسی ایک پہلو کو معرضِ بحث بنانا، کوئی ایسی بات نہیں، جس پر نجات کا یا کم از کم مسئلہ حیات النبیؐ کے ثبوت یا عدمِ ثبوت کا مدار ہو۔ موت کو اگر اسی عام معنی میں لے لیا جائے، جو جمہور کی رائے ہے، تو بھی مسئلہ زیرِ بحث میں مقصودِ کلام قطعاً متأثر نہ ہوگا۔ ہاں یہ پیشِ نظر رہے کہ رُوح کے بدن میں مقیّد رہنے کا نام ہی حیات نہیں رُوح بدن سے نکل بھی جائے، لیکن اس کا کوئی خاص تعلق یا اثر بدن کے ساتھ قائم رہے، تو اس صورت بھی بدن کو صفتِ حیات حاصل رہے گی۔ محقق ابنِ ہمامؒ کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں رُوح اور حیات میں تلازمہ نہیں، تاثیر و تعلق ہی وجودِ حیات کے لئے کافی ہے۔ متن فقہِ اکبر میں جو یہ جزئیہ داخلِ عقائد ہے کہ:۔

اعادة الروح الی العبد ۔ بندے کی طرف (قبر میں) رُوح کا لوٹایا جانا حق ۔ (شرح فقہ اکبر صلہ ۱۲) برحق ہے ۔

مُمکن ہے اِس میں حرفِ "الی" اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہو کہ رُوح کو بدن میں لوٹنا ضروری نہیں ۔ بدن کی طرف لوٹنا ہی اِس حیات فی القبر کے لئے کافی ہے، جس پر سوالِ نکیرین اور ازاں بعد ادراکِ الم و لذّت کے احکام مرتب ہو سکیں واللہ اعلم بالصواب وعلمہٗ اتم واحکم فی کل باب ۔

یاد رکھیے، موت فنائے محض کا نام نہیں ۔ وُہ تو اِنتقالِ دارین کے تحقق کا نام ہے کہ اِنسان اِس عالَم دُنیا سے اُس دُوسرے عالَم میں چلا جائے ۔ علّامہ عینی رحؒ لکھتے ہیں :۔

الموت لیس بعدم انما ھو انتقال من دار الی دار ۔ (عینی علی البخاری جلد ۶ صـ ۶۹) موت ایک عدمی چیز نہیں، بلکہ وُہ تو ایک عالَم سے دُوسرے عالَم میں منتقل ہو جانے کا نام ہے ۔

لیس بعدم محض ولا فناء صرف (بشرای الکئیب صـ ۱۶) موت ہرگز عدمِ محض اَور فنائے خالص کا نام نہیں ۔

حجۃ الاسلام حضرتِ امام غزالی رحؒ کے الفاظ میں " ایک لباس اُتار کر دُوسرا لباس پہننے کا نام موت ہے ۔"

مَوت کیا ہے یہ راز کھُل ہی گیا !
زندگی اِک رُخ بدلتی ہے !
اِس کنارے سے اُس کنارے تک
جیسے اِک مَوج جا نکلتی ہے !

جاننا چاہیے کہ کُفّارِ عرب کی طرح مَوت کے متعلق قرآنِ عزیز کا نظریہ

فنا کے قابل کا نہیں۔ انبیاء و صلحاء تو درکنار کُل بنی آدم ذائقۂ موت چکھنے کے بعد پھر انھی اجسامِ عنصریہ کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے۔ اگر آخرت میں یہ جسمانی زندگی محلِ استبعاد نہیں تو اگر اللہ تعالیٰ بعض نفوسِ قدسیہ کو عالمِ برزخ ہی میں یہ جسمانی زندگی عطا فرما دیں تو اس میں کون سا استبعاد ہے۔ اگر آپ کی عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی تو عالمِ آخرت کی عنصری حیات کا ادراک بھی بجز قدرتِ پروردگار کے اور کیسے ہو سکتا ہے! فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار۔

قرآنِ عزیز کہتا ہے :۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ○ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ○ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِىْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِىْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ

(بنی اسرائیل پ ۱۵)

اور کہتے ہیں کہ جب ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے، کیا پھر نئے سرے سے بن کر اٹھیں گے؟ آپ کہہ دیجیے کہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور خلقت جس کو تم اپنے دلوں میں مشکل سمجھ لو۔ پھر پوچھیں گے، کون ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ فرما دیجیے، جس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔

پھر فرمایا :۔

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۔ (الانبیاء پ ۱۷)

جیسے ہم نے پہلے بنایا تھا، اسی طرح پھر اس کو لوٹائیں گے، ہمارا ضرور وعدہ ہے۔ ہمیں پورا کرنا ہے۔

جن ذرات کو مٹی کھا چکی، وہاں کہاں سے آئیں گے؟ فرمایا :۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ

ہمیں معلوم ہے، جو زمین کھا رہی ہے،

الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيظٌ (قٓ پ ۲۶)
ان میں سے اور ہمارے پاس سارا ریکارڈ محفوظ ہے۔

مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ۔ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (يٰسٓ پ ۲۳)
کون ان ہڈیوں کو ریزہ ریزہ ہونے کے بعد پھر زندہ کر دے گا؟ آپ فرما دیجیے، وُہی انھیں دوبارہ زندہ کر دے گا جس نے انھیں پہلی بار بنایا تھا۔ اور سب بنانا جانتا ہے۔

کفّار و مشرکین کو حیرت تھی کہ ہڈیوں کے ریزہ ریزہ ہونے کے بعد پھر حیاتِ انسانی کیسے ان ذرّوں میں عود کر آئے گی؟ رب العزت نے فرمایا یہ ریزے اور چُورا تو بہرحال انسانی لاش ہے، جس میں پیشتر زندگی رہ چکی ہے اور خود مٹی کے ذرّات میں بھی آثارِ حیات کا پیدا ہونا چنداں مستبعد نہیں۔ مَیں اس سے بڑھ کر تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ ہڈیوں کا چُورا نہیں، اگر ممکن ہے تو پتھر میں تبدیل ہو جاؤ یا لوہا بن جاؤ، جو آثارِ حیات قبول کرنے کی بظاہر صلاحیت نہیں رکھتے، بلکہ ان سے بھی کوئی زیادہ سخت چیز جس کا زندہ ہونا تمھیں لوہے اور پتھروں سے بھی زیادہ مشکل نظر آئے، بن کر دیکھ لو، حتّٰی کہ موتِ مجسّم بھی بن جاؤ، تو اس قادرِ مطلق کے لیے تمھیں پھر اسی جسدِ عنصری سے زندہ کر دینا کوئی مشکل نہیں۔

ایک سوال

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک میں جہاں جہاں بھی حشرِ آخرت کا ذکر ملتا ہے، وہاں ہڈیوں کے چُورے اور ذرّاتِ منتشرہ کو پھر جمع کرنے اور زندہ کرنے کا تذکرہ ضرور آتا ہے۔ جہاں اجمال ہے، وہاں بھی یہ مفہوم منطوی ہے؛ گویا کہ

حشرِ آخرت کے لیے زمین یہی ہے کہ ریزہ ریزہ ہڈیاں اور ذرّاتِ منتشرہ پھر اٹھائے جائیں پس جب اُس دِن انبیاء بھی اُٹھائے جائیں گے، تو اُن کی یہ بعثت ذرّاتِ منتشرہ اور عظامِ رمیم سے کیوں نہ ہوگی۔ حدیث شریف کے اِس مضمون سے کہ "زمین پر حرام ہے کہ انبیاء کے جسموں کو مٹی بنائے" ان کا اجسادِ سالمہ سے اٹھایا جانا، کیا قرآنِ پاک کے اُن مضامین کے خلاف نہیں، جہاں "حشرِ آخرت" ہڈیوں کے چُورے اور ذرّاتِ منتشرہ پر مبنی ہے؟

اگر انبیاء اس عموم سے مستثنیٰ ہیں تو کیا اس تخصیص کے لیے اتنے درجے کی قوی دلیل موجود ہے جتنے درجے کی قوی یہ اصل ہے کہ حشرِ آخرت، ذرّاتِ منتشرہ اور عظامِ رمیم سے ہوگا۔ کیا حدیث اس عمومِ قرآن کی تخصیص کر سکتی ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ کو حشرِ آخرت میں دوبارہ لباسِ حیات پہنانے کی ضرورت ہی نہیں۔ عامۃ الناس کو جو زندگی اور کامل حیاتِ عنصری اُس دن ملے گی، وہ انبیائے کرامؑ کو پہلے ہی سے عالمِ برزخ میں حاصل ہے اور وہ اپنی قبور ہی میں اس حیات بعد الوفات پر فائز کر دیے جاتے ہیں۔ اُس دن تو انھیں اپنی اپنی قبور سے صرف نکلنا ہی ہوگا، قدرتِ ایزدی سے ان قبورِ شریفہ کو صرف شق کیا جائے گا بخلاف عامۃ النّاس کے کہ وہ خود نکلنے کی حالت میں نہیں ہوں گے، بلکہ انھیں قدرتِ ایزدی سے نکالا جائے گا۔ انبیائے کرامؑ کے قیامت کے دِن زندہ رکھے جانے کا ثبوت کسی روایت سے نہیں ملتا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

انا اوّل الناس خروجًا	جب لوگ حشر کے لیے اٹھائے جائیں گے،
اذا بعثوا (مشکوٰۃ ص ۵۱۴)	تو سب سے پہلے قبر سے نکلنے والا میں ہوں گا۔

پس یہاں حدیث سے تخصیصِ کتاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انبیائے کرامؑ حشرِ آخرت کے اس پورے مضمون ہی سے شانِ امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کی اگر یہ

یہ خصوصیت ہے کہ ورودِ وفات کے بعد ان کے اجسامِ عنصریہ میں ریزہ ریزہ ہونے کے بغیر پھر حیات عود کر آئے گی تو یہ مضمون بھی صحیح ہے کہ اس حیات بعد الوفات کا تحقق قیامت کے دن نہیں بلکہ قبورِ شریفہ ہی میں پیشتر ہو چکا ہے۔ پہلے مضمون پر سب کا اتفاق ہے کہ انبیائے کرام کے لیے اعادۂ حیاتِ اجسامِ عنصریہ کے ریزہ ریزہ ہونے کے بغیر ہے۔ پس یہ قرآنی مضمون کہ حشرِ آخرت کی زمین "ذراتِ منتشرہ" اور "عظام رمیم" ہے" اگر "عام مخصوص منہ البعض" کے درجہ میں ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی تخصیص خبرِ واحد سے محلِ کلام نہیں۔ بنائے علیہ اس حدیث کی وجہ سے کہ "الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون" کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح عامۃ الناس کو حشرِ آخرت میں کامل حیاتِ عنصری ملے گی، انبیائے کرام اس سے بہت پہلے اپنی اپنی قبورِ شریفہ ہی میں فائز الحیات ہو چکے ہوتے ہیں۔

پس اس باب میں احادیث سے استدلال خصوصاً جبکہ وہ تواترِ معنوی سے اپنے مضمون کو ثابت کر رہی ہوں عین مقتضائے موضوع ہے، یونہی آیات سے الجھتے چلے جانا اور قلبِ موضوع کرنا یہ کوئی امرِ مستحسن نہیں۔

ارشاداتِ پیغمبرِ خاتم شریعتِ اسلام میں قانونی حیثیت رکھتے ہیں۔ صحابہ کے عہدِ سعادت مہد سے سلسلۂ روایت چلا، تابعین کے عہد کے بعد علمِ حدیث فنِ حدیث سے وابستہ ہوا اور راویوں کے حالات، ان کی جرح و تعدیل اور اتصال و ارسال ایک مستقل موضوع بن گئے۔ اس تحقیق و تنقیح کی جوں جوں ضرورت بڑھتی گئی، محدثین کے قواعد و ضوابط مدون ہوتے چلے گئے۔ راویوں کے حالات سے بھی اور محدثین کی جرح سے بھی روایات کے صحیح و سقیم ہونے کا پتہ چلتا رہا۔

یہ بات کافی نہیں کہ کسی سلسلۂ روایت میں جب کوئی ایسا راوی ملے، جس پر کسی نے جرح کی ہو، تو یکسر ہی اس روایت کو چھوڑ دیں۔ بلکہ دیکھا جائے گا کہ تعدیل کرنے والے کون کون ہیں اور کتنے ہیں اور جرح کرنے والے کون کون اور کتنے۔ جرح مدلل ہے یا غیر مدلل اور محدثین کے نزدیک مقبول ہے یا مردود۔ غرضکہ یہ ایک مستقل فن ہے، جس تک رسائی بغیر فنی مہارت کے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ عوام کو تو یہاں بھی

اکابرِ فن کی تقلید سے چارہ نہیں۔ علمی تنقیحات اور فنّی مباحث میں عام لوگوں کو کوئی جرح یاد کرا دینا اور پھر ائمۂ فن سے استغنا برتنے کی آبیاری کرنا، عام کہتے رہنا کہ اہلِ سُنّت کے پاس اپنے مسلک کی حمایت میں صرف منکر اور ضعیف قسم کی ہی روایات ہیں، اگر تشغیبِ العوام نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ جہاں بھی عوام کو مغالطہ دینے اور تعصّب و تحزّب کا شکار کرنے کے لیے کافی گنجائش رہی ہے۔ جہاں انکار مطلوب ہوا کسی راوی پر ادنیٰ اشارۂ جرح بھی معاف نہ ہونے دیا اور جہاں خود ضرورت درپیش ہوئی، وہاں تصحیحِ محدّثین کا سہارا لے لیا۔ فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکیٰ!

جہاں صحیح مسلمؒ اور ابو داؤدؒ تک کی احادیث "موضوع روایات" کے تحت درج کی جا رہی ہوں اور اس مکتبِ فکر کے حدیث پڑھنے پڑھانے والے علماء تک اس جسارت پر خاموش ہوں تو اس سے چارہ نہیں کہ اس اندازِ فکر پر خون کے آنسو بہائے جائیں سہ

طبعت علی کدر وانت تریدھا

صفواً من الاقذار والاکدار

ایسے پُر خطر دَور میں، جبکہ احترامِ سلف اور فکرِ آخرت کا دائرہ سمٹتا چلا جا رہا ہے، جہاں یہ امر ضروری ہے کہ ملک و ملت کی مہمات میں تعبیری اور فروعی اختلافات میں نہ اُلجھا جائے، وہاں اس ضرورت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ دینی طبقوں میں جہاں بھی "اعتماد علی السّلف" کے خلاف کوئی چنگاری سُلگتی نظر آئے، اُسے اول وہلہ ہی میں سُلا دینے کی پوری جِدّ و جُہد کی جائے۔ بیرونی حملے کے وقت بھی تو اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اندرونی آتش زدگی ہی کہیں خرمنِ حیات کو خاکستر نہ بنا دے۔

ہاں، اگر طریقِ اختلاف ایسا ہو جس میں اکابر کے خلاف جذباتِ تنفر نہ پیدا ہو رہے ہوں، تو پھر یہ اختلافِ رائے برداشت کر کے اصولی مسائل میں سب ایک ہی چشمۂ اتحاد سے سیراب ہو سکتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ یہ اختلافات تفرداتِ محققین کا مقام پالیں۔

اس سے انکار نہیں کہ نظریاتی مسائل میں اختلافِ رائے ہو سکتا ہے، لیکن اگر بعض اکابر سے اختلاف ہو تو بعض دوسرے اکابر کی تائید کے ساتھ اور اس امر کی وضاحت کے ساتھ کہ مؤقف قطعی نہیں، اجتہادی ہے آخر جانبِ مخالف بھی احتمالِ صواب سے خالی نہیں۔ الغرض ہر شے اپنے محل پر رہے تو اختلاف کے باوجود نزاع کی صورتیں پیدا نہیں ہوتیں۔

اس رسالۂ ہدایت مقالہ میں اُس آفتابِ رشد و ہدایت کے زندہ جاوید ہونے کا بیان ہے، جس کے نورِ عرفان نے لاتعداد ذرّوں کو غیرتِ خورشید بنا دیا تھا اور جس کی تابانی آج بھی بھٹکتی مخلوق کو چشمۂ ہدایت سے سیراب کر رہی ہے۔ ان اُرید الا الاصلاح وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب!

تمہید

الحمد للہ الکبیر القادر علیٰ جمیع الممکنات المرید لجمیع الکائنات والصلوٰۃ والسلام علیٰ جمیع الھداۃ بالزبر والبیّنات الذین ھم احیاء فی قبورھم بعد الممات خصوصًا علیٰ خاتم الرسل وافضل المخلوقات سیدنا ومولانا محمدٍ الذی ھو حی فی روضۃ من ریاض الجنات وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ الذین یقتبسون من نور حیاتہ فی الحیات وبعد الوفات - امّا بعد:-

عالمِ برزخ کے حالات پر ایک ایسا پردہ پڑا ہے، جو اُٹھایا نہیں جا سکتا —— قرآنِ کریم نے عالمِ دنیا اور عالمِ آخرت کی تفصیلات تو بہت پیش کی ہیں، لیکن درمیانی منزل —— عالمِ برزخ —— پر اجمالی اشارات ہی کی مصلحت کارفرما ہے۔ برزخ ایک ایسا پردۂ خفا ہے کہ وہاں کے حالات عامۃ النّاس کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ عالمِ آخرت کا جتنا حصّہ اس پردۂ خفا میں ہے، اُسے ہی عالمِ برزخ کہا جاتا ہے، اس کی انتہا قیامت پر ہے:-

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (مؤمنون پ۱۸) — اور ان کے پیچھے قیامت کے دن تک ایک پردہ ہے۔

انسان اس عالم میں پہنچ کر دنیا والوں سے پردہ میں ہو جاتا ہے اور آخرت

بھی پُوری طرح سامنے نہیں آئی ہوتی، صرف اس کا تھوڑا سا نمونہ سامنے رہتا ہے، باقی بھئ ہی پردہ ہے، جو نہ ہٹتا ہے، نہ چھٹتا ہے۔

ہاں انبیاء کرام اور اولیاء عظام نے اس کائنات کے اسرار و رموز کا بارہا مشاہدہ کیا ہے اور ربّ العزت نے کئی دفعہ اس عالم کو ان پر منکشف فرمایا۔

ظاہر ہے کہ گاہے گاہے کی یہ جھلکیاں اور انکشافات کے یہ پرتو اس مادی کے ناآشنا ماحول میں عالم برزخ کے روابط و ضوابط کی مکمل کڑیاں نہیں ملا سکتے۔ پس ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ آں حضرت نے جو کچھ فرما دیا، اس پر یقین رکھیں اور برزخ کا جو پہلو معرضِ خفا میں رہا، اس میں قیاسات کے گھوڑے نہ دوڑائیں اور فوق العقل کو خلافِ عقل قیاس کرتے ہوئے منقولاتِ صحیحہ کے انکار کے درپے نہ ہوں۔

حیاتِ انسانی کے چار دور

عالمِ ارواح:-

یہ وہ پہلی زندگی ہے جس میں عہدِ الست[1] لیا گیا تھا " وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ " کی شہادت اسی دور کی ہے اور موجودات پر دلالت کرتی ہے اس وقت ارواح کو کچھ ہدایات[2] اور بشارات ربّ العزت کی طرف سے ملی تھیں۔ اس دور کی انتہا والدہ کے پیٹ میں ہوتی ہے، جب جسدِ جنین میں رُوح داخل ہوتی ہے۔ اس عالم کو عالمِ ارواح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے سوا جتنے بھی انسانی زندگی کے دور ہیں سب میں رُوح کے ساتھ بدن متعلق ہے، خواہ جلی طور پر جیسا کہ اس دنیا میں ہوتا ہے اور خواہ نہایت

---

[1] اعراف ۔

[2] مثل قوله تعالیٰ " يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ "۔ (اعراف پ ع ۴)

لطیف انداز میں، جیسا کہ قبر میں ہوتا ہے۔ بہرحال اِس سے گریز نہیں عالمِ مثال میں بھی جسم سے چارہ نہیں: خواہ وہ کوئی دُوسرا جسم ہی کیوں نہ ہو۔ عالمِ ارواح صرف ایک عالم ہے اور صرف اسی میں انسان کی زندگی رُوحانی زندگی ہے۔

عالمِ دُنیا:—

اِس کا معنی قریبی زِندگی کا دَور ہے۔ قرآن اسے "اَلْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا" سے تعبیر کرتا ہے۔ اِس میں رُوح و بدن کا تعلق نہایت مضبوط ہوتا ہے، مگر جسد کے احکام رُوح پر غالب رہتے ہیں[1]۔ یہاں حیات کا تقوّم اِس دُنیا کے بدنِ مادّی پر ہوتا ہے۔ تغذیہ و تنمیہ اِس زِندگی کے لوازم ہیں۔ اِس دور کی اِنتہا موت پر ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات مرنے سے پہلے ہی اگلی زِندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی عالم "دارُالتکلیف" ہے اور یہی "دارُالعمل" جس کے ذخیرہ پر بعد کی جزا یا سزا مرتّب ہوتی ہے۔

عالمِ برزخ:—

مَوت کے بعد سے لے کر قیامت تک یہ دَور قائم رہتا ہے۔ اِس میں رُوح اَور بدن یا رُوح اَور اجزائے بدن کے مابین نہایت لطیف اَور قوی تعلق[2]

---

[1] قال العارف الجامی ان الغالب فی هٰذا العالم احکام الاجساد و احکام الروح مستورة لظهور الجسد وخفاء الروح وینعکس الحال فی البرزخ و تظهر احکام الروح اما المحشر فیستاوی فیه الحکمان والله اعلم۔

[2] یہ تعلق یا تو اِس طرح قائم ہوتا ہے کہ رُوح، بدن یا اجزائے بدن پر اپنی تاثیر ڈالتی ہے اَور جیسا رُوح کا مقام ہو اس کے مناسب بدن یا اجزائے بدن میں آثارِ حیات قائم ہو جاتے ہیں اَور یا خود رُوح ہی علّیین یا سجّین سے آ کر داخلِ بدن یا اجزائے بدن کر دی جاتی ہے اَور وہ تعلق قائم ہو کے پھر اپنے اپنے مستقر میں لوٹ جاتی ہے۔ اگر رُوح کمزور ہو اَور ذرّاتِ تن بھی منتشر ہو چکے ہوں تو پھر یہ حیات نہایت کمزور قسم کی ہوتی ہے "در قبر احیاء نه آنکه حقیقی نیست بسبب انعکاس اشعهٔ روح بر بدن تعلقے پیدا می شود که تغذیه و تنمیه همراه آں نمی باشد" (تحفهٔ اثنا عشریه ص ۲۴۴ نولکشور) ان ارواح کو ایک علاقہ اپنی قبر سے بھی ہوتا ہے کہ آنے سے زیارت کرنے والوں کی اور اقربا اَور دوستوں سے مطلع ہوتے ہیں۔ کیونکہ رُوح کو قرب و بُعدِ مکانی اس دریافت کو مانع نہیں ہوتا۔ (تفسیر عزیزی پ ۳۰ ص ۸۸ مطبع فاروقی دہلی)۔

قائم ہوتا ہے۔ اس میں دُنیا والوں سے بھی پردہ ہوجاتا ہے اور آخرت بھی پُوری طرح سامنے نہیں آتی۔ یہاں کی زِندگی کے لیے رُوح اور حیات میں ملازمہ[1] نہیں؛ رُوح اگر بدن میں نہ بھی داخل ہو، صرف تاثیر ہی کر رہی ہو، تو بھی حیات کا تقوّم ہوجاتا ہے۔ قبر کی منزل[2] اِسی دَور میں شمار ہوتی ہے۔ یہ عالم ایک جہت سے مواطنِ دُنیوی سے بھی متعلق ہے اور گنجائشِ ترقی رکھتا ہے۔ (مکتوباتِ حضرت مجدّد الف ثانیؒ دفتر ۲ ع۱۶ ص۲۹ لکھنؤ)

عالمِ آخرت:-

یہ وُہی آخری مقام ہے جسے قرآنِ کریم "دارُالقرار" کہتا ہے۔ یہ ہمیشہ ٹھہرنے کا گھر ہے۔ جنّت اور جہنم اِسی دُنیا کے دو مختلف نقشے ہیں۔ یہی زندگی "ابقیٰ" ہے، (پ۳۰ اعلیٰ) آگے فنا نہیں إِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (پ)

یہ چاروں ادوار بالترتیب چلتے ہیں، البتہ صفاتِ مُختلفہ مختلف جہات سے جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اِن میں سے کوئی دو عالم آپس میں متوازی نہیں۔

---

[1] الحیٰوۃ فی اللغۃ شیء مغائر للروح لا عینہ بل ثمرۃ تعلقہ وقد زعم بعض الناس انہ نفس الحیٰوۃ ولیس کذالک ففی النصوص ذکر الحیٰوۃ ولیست روحًا واطلاقات الروح فی عقیدۃ السفارینی جلد ۲ ص۲۹ تعمقہ الاسلام ص۳۶ ان ملازمۃ الحیٰوۃ للروح امر عادی لا عقلی فھٰذا مما یجوزہ العقل (شفاء السقام ص۱۵۹)۔ [2] عالمِ برزخ کا محل صرف قبر کا ظاہر نہیں، بلکہ اس قبر کی ایک فوق الادراک حیثیت ہے۔ بعض قبور اپنی برزخی حیثیت میں میلوں تک وسیع ہوسکتی ہیں، اگرچہ عام نظروں میں وہ ایک گڑھا ہی دکھائی دیں اور بعض اپنی ظاہری کشادگی سے بھی تنگ ہوسکتی ہیں، اگرچہ ظاہر میں کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ پس حقیقتِ قبر صرف اسی ظاہری گڑھے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک عالمِ برزخ کی منزل ہے۔ یہ قبر صرف اس منزل کا ایک پہلو ہے اور اس کی ظاہری علامت ہے۔ اس کی برزخی وسعت و فسحت کو ربّ العزّت ہی جانتے ہیں یا وہ مقدس ہستیاں جن پر عالمِ برزخ کا انکشاف ہو رہا ہو، اُن سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس ظاہر قبر کو حقیقتِ قبر سے کوئی علاقہ نہیں یا برزخ اس قبر سے کوئی بالکل مغایر چیز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فلهذه الانفس اسابيع دور كل دار اعظم من التى قبلها (کتاب الروح ص ۱۴۴)۔

ہاں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بہت سی احادیث سے استنباط کرکے ایک ایسے عالم کا پتہ دیا ہے، جو عالم ارواح کے سوا حیاتِ انسانی کے باقی ادوار کے متوازی چلتا ہے۔ یہ عالم عنصری نہیں[1] اور اسے عالم مثال کہتے ہیں:۔

دلت احادیث کثیرة علی ان فی الوجود عالما غیر عنصری یتمثل فیہا المعانی باجسام مناسبة لها فی الصفة۔

(حجة اللہ البالغہ ص۱ مصر)

بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں کہ ایک اور جہان موجود ہے، جو عنصری نہیں اس میں معانی صفات اور اعراض اُس اُس صورت اجسام میں متمثل ہوتے ہیں، جو صفات میں اُن کے مناسب ہو۔

عالمِ ارواح، عالمِ دُنیا، عالمِ برزخ، عالمِ آخرت اور عالمِ مثال کے حالات اور اُن کی صفات آپ کے سامنے ہیں۔ اب عالمِ برزخ میں قبر کے الم ولذت کی کیفیت اکابر سے سُنیئے :۔

عذاب القبر

(۱) ثم السوال عندی یکون بالجسم مع الروح کما اشار الیہ صاحب الھدایة۔

(فیض الباری مولانا السید انور شاہ جلد ۲ ص ۱۸۱)

(۱) میرے نزدیک قبر کا سوال وجواب رُوح وجسد کے مجموعہ سے ہوگا اور صاحب ہدایہ نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

---

[1] سورہ بقرہ اور آلِ عمران کا قیامت کے دن کا آنا اعمال کا جو اعراض ہیں متجسد ہونا، دُنیا کا بوڑھی عورت کی شکل میں آنا، موت کا مینڈھے کی شکل میں ظاہر ہونا وغیرہ وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں

(۲) یصح ان یعرض علی الانسان المجموع المرکب من الجسد والروح مقعدہ من الجنۃ او النار ویحس اللذۃ والالم۔
(مظہری جلد ۱۰ ص۲۲۵)

(۲) یہ صحیح ہے کہ قبر میں جنت اور دوزخ کے ٹھکانے رُوح وجسد کے مجموعہ پر پیش ہوتے ہیں اور رُوح وجسد سے مرکب انسان ہی قبر کے لذّت والم کا ادراک کرتا ہے۔

(۳) ولا یرد تعذیب المیت فی قبرہ لانہ توضع فیہ الحیاۃ عند العامۃ بقدر ما یحس بالالم والبنیۃ لیست بشرط عند اہل السنۃ بل تجعل الحیاۃ فی تلک الاجزاء المتفرقۃ لا یدرکہا البصر۔
(رد المحتار شامی باب الیمین فی الضرب والقتل جلد ۳ ص۲۰۱)

(۳) عذابِ قبر کا انکار نہ کیا جائے، کیونکہ جمہور اہلِ سُنّت کے نزدیک میّت میں اس قدر حیات رکھی جاتی ہے کہ وہ لذّت والم کا ادراک کر سکے، اور جسم کا یکجا ہونا اس ادراکِ الم کے لیے اہلِ سُنّت کے ہاں کوئی شرط نہیں، بلکہ وہ حیات اجزائے منتشرہ میں بھی اس طرح رکھی جا سکتی ہے کہ بہ ظاہری آنکھیں اسے نہ پا سکیں۔

(۴) واعلم ان اہل الحق اتفقوا علی ان اللہ تعالیٰ یخلق فی المیت نوع حیاۃ فی القبر قدر ما یتألم او یتلذذ۔
(شرح فقہ اکبر ص۱۲۱)

(۴) یہ جان لیجیے کہ اہلِ حق (اہلِ سُنّت) کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ میّت میں بحالتِ قبر ایک اس طرح کی حیات ضرور پیدا فرما دیتے ہیں کہ وہ (معاملاتِ قبر میں) الم یا لذّت کا ادراک کر سکے۔

(۵) ان مذہب سلف الامۃ وائمتہا ان المیت اذا مات

(۵) سلفِ امت اور ائمۂ اہلِ سُنّت کا فیصلہ یہی ہے کہ مرنے کے بعد میّت کے

یکون فی نعیم او عذاب و ان ذالك یحصل لروحه و بدنه (کتاب الروح ص۶۳)

یعنی نعیم و عذاب کے معاملات برحق ہیں اور (قبر میں لذت و الم کا) یہ ادراک رُوح و بدن کے مجموعہ کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۶) ان النعیم والعذاب لا یکون الا علی الروح وان البدن لا ینعم ولا یعذب وھذا تقوله الفلاسفة المنکرون لمعاد الابدان وھؤلاء کفار باجماع المسلمین ویقوله کثیر من اھل الکلام من المعتزلة وغیرھم الذین یقرون بمعاد الابدان لکن یقولون لا یکون ذالك فی البرزخ وانما یکون عند القیام من القبور لکن

(۶) قبر کا ثواب و عذاب صرف رُوح کو ہوتا ہے اور بدن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اُن فلاسفہ کا قول ہے، جو "معادِ ابدان" کے بھی منکر ہیں اور یہ لوگ بالاجماع مسلمان نہیں معتزلہ کے متکلمین کا، جو "معادِ ابدان" کا اقرار کرتے ہیں، بھی قبر کے ثواب و عذاب کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ وہ معاملہ ابدان کو صرف حشر میں تسلیم کرتے ہیں، برزخ میں اس کے قائل نہیں۔ ان معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ عذابِ قبر صرف رُوح سے متعلق ہے بدن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

ھؤلاء ینکرون عذاب البدن فی البرزخ فقط۔ کتاب الروح ص۶۲

(۷) بدنِ اوّل لا از حصولِ احکامِ برزخ چارہ نبود و از عذاب و ثوابِ قبر گزند نہ.. ،

(۷) اس سے پہلے بدن (عنصری) پر احکامِ برزخ ضرور وارد ہوتے ہیں اور اس بدنِ اوّل کو عذابِ قبر اور ثوابِ قبر کے معاملات سے ہرگز چھٹکارا نہیں۔ افسوس

.... افسوس ہزار افسوس، ایں قسم بطالان خود را مسند شیخی گرفتہ اند

ہزار افسوس، ان فریب کاروں پر جو شیخ ہونے کی مسند بچھائے ہوئے ہیں، مسلمانوں کے

وَمِنْھُمْ اے اہلِ اسلام گشتہ ضلوا و اضلوا۔ (مکتوباتِ امام ربّانی دفتر ۲ ص ۱۱۶)	منقسم ہوتے ہیں (اور پھر ان اُمور کا انکار کرتے ہیں)۔ یہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔

تنقیح المبحث

مختلف ادوارِ حیات کی تفصیل اس لیے کی گئی ہے کہ اصل موضوع جس پر پورے سوادِ اعظم کا اجماع ہے مشتبہ ہو کر نہ رہ جائے۔ برزخی کیفیات کی تفصیل اس لیے ہے کہ اس دُنیا والے بدن یا اس کے اجزا کو عالمِ برزخ میں روح سے کلّی طور پر جدا نہ سمجھا جائے بلکہ ہر کسی کے لیے اس کے مقام کے مطابق روح و بدن کا تعلق قائم تسلیم کیا جائے۔

جملہ اہلِ اسلام کا اتفاق اور اجماع ہے کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر وفات شریفہ وارد ہوئی اور وعدہ ان موت سے "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ" کا وعدہ پورا ہوا۔ آپ کے لیے جس قسم کی وفات مقدر تھی اس کا وجود ہوا اور آپ نے یقیناً اس عالمِ دنیا سے عالمِ برزخ میں انتقال فرمایا۔ روضۂ منورہ برزخ کا محل اور آخرت کی پہلی منزل ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ارشاد فرماتے ہیں:۔

"حسبِ ہدایت "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ" اور "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ" تمام انبیائے کرام علیہم السّلام خاص کر حضرت سرورِ انام صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت موت کا بھی اعتقاد ضرور ہے"۔

(لطائفِ قاسمی ص ۴ مطبع مجتبائی)

"بالجملہ موتِ انبیاء اور موتِ عوام میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۔

(آبِ حیات ص ۲۲۵)

اس پر بھی پورے سوادِ اعظم کا اجماع ہے کہ حضورؐ کے پردۂ قبر میں جانے کے بعد پھر آپؐ کے جسدِ اطہر میں حیات لوٹا دی گئی۔ دخولِ رُوح سے اس دُنیا والے جسمِ عنصری میں اعادۂ حیات ہوا یا تاثیرِ رُوح سے آپؐ کے جسدِ عنصری میں حیات لوٹ آئی؟ اس میں کچھ خفیف سا اختلاف ہوا۔ لیکن انجام کار سب کا اتفاق ہے کہ آپؐ کا جسدِ اطہر روضۂ منوّرہ میں محض بے حس و شعور نہیں، بلکہ فائز الحیات ہے۔ آپ کی یہ حیاتِ قدسیہ باعتبار تعلّق بالبدن جسمانی، باعتبارِ تعلّق بالرّزق رُوحانی اور باعتبارِ تعلّق بالعالم، برزخی ہے۔

ان سطور سے یہ حقیقت بے غبار ہو گئی کہ اصل مبحث مطلق حیات نہیں، بلکہ حیات بعد الوفات ہے۔ پس وہ آیات یا روایات، جن سے ثبوتِ وفات سیّد الکائنات کا استدلال ہوتا ہو، ہمارے مُدّعا کے قطعاً خلاف نہیں۔ مسئلۂ زیرِ بحث میں انھیں بار بار دُہرانا اور محلِ نزاع بنانا یقیناً خروج عن المبحث ہے۔ اہلِ سُنّت کا عقیدہ حیات النبیؐ کے مسئلہ میں یقیناً "حیات بعد الوفات" کا ہے۔ پہلے وفات کا ورود و بعد کے زندہ ہونے کے ہرگز منافی نہیں۔ خطبۂ صدیقیؓ صرف اُن لوگوں کے خلاف ہی پیش ہو سکتا ہے، جو آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر کسی قسم کے طریانِ موت کے قائل نہ ہوں۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ طریانِ موت کی کیفیت میں تو اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن ورودِ موت سے انھیں بھی اختلاف نہیں۔ یہ حقیقت ان کو بھی تسلیم ہے کہ جس قسم کی وفات آپؐ کے لیے مقدّر تھی، وہ آپؐ پر وارد ہوئی اور وعدۂ الٰہیہ حضورؐ پر بھی پورا ہو کر رہا تھا۔

طریانِ موت اور اعادۂ حیات کے احتمالاتِ ثلٰثہ

صورتِ واقعہ خواہ کچھ ہو،

روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی پھر بھی قدرِ مشترک ہے

احتمالِ اوّل:-

آپ کی وفاتِ شریفہ بمعنیٰ "ابانۃ الروح عن الجسد" ہے لیکن روحِ مبارک جسدِ اطہر سے جدا ہونے اور رفیقِ اعلیٰ اور علیین کی سیر کرنے کے بعد[1] پھر قبرِ شریف میں رکھے ہوئے جسدِ اطہر میں لوٹا دی گئی۔ روحِ اقدس کا اعلیٰ علیین سے تعلق بھی رہا اور روضۂ منورہ میں رکھے جسدِ اطہر میں بھی حیات لوٹ آئی اور اس طرح روح و بدن میں ویسا ہی قوی تعلق قائم ہو گیا، جو اس دنیا میں تھا، بلکہ اس سے بھی قوی تر، کیونکہ یہ حیاتِ دنیوی رزقِ مادی کی محتاج ہے، لیکن اس عالمِ برزخ کی حیاتِ عنصری جسمانی اس دنیا کے رزقِ مادی پر مبنی نہیں، اس کا تقوم رزقِ روحانی پر ہے اور ہمارے شعور سے بالاتر ہے۔

---

[1] اعلیٰ علیین میں اس وقتی داخلے اور تعلق قائم کر کے پھر روح کے واپس ہو جانے پر تعجب نہ ہو۔ اس لیے کہ جب حضرت جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام نے ایک خواب میں حضورؐ کو اس عالم کی سیر کرائی تھی اور حضورؐ نے وہاں اپنی منزل دیکھی تھی، تو آپؐ اس میں داخل ہونے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا داخل ہونے کا ارادہ وہاں رہنے کے لیے نہ تھا، بلکہ آپ محض سیر کے طور پر وہاں داخل ہونا چاہتے تھے، اس پر حضرت جبرئیلؑ اور حضرت میکائیلؑ نے کہا تھا "انه بقی لك عمر لم تستكمله فلو استكملت اتيت منزلك" (بخاری کتاب الجنائز جلد اول ص[illegible]) "آپ کی عمرِ شریف میں سے کچھ حصہ باقی ہے۔ جب آپ اس کی تکمیل فرما لیں گے تو پھر آپ اپنی اس منزل میں آئیں گے"۔ جب یہ کلام اس وقتی داخلے کے جواب میں تھا تو متبادر یہی ہوتا ہے کہ انتقالِ عمر کے بعد وہاں جو داخلہ میسر ہوگا وہ بھی بطور سیر اور کچھ وقت کے لیے ہی ہوگا۔ بعد میں کیا ہوگا، یہاں اس کی تفصیل نہیں، ورنہ یہ اس کا مقام تھا۔ ہاں اس روایت کے کسی طریق میں بھی یہ الفاظ نہیں مل سکے کہ "آپ انتقالِ عمر کے بعد اس منزل ہی میں ہمیشہ رہیں گے"۔ فمن ادعی فعلیه البیان۔ بہرحال یہ ایک خواب تھا جس کی تحقیق اس وقت مقصودِ کلام نہیں۔ ممکن ہے اس کی تعبیر کچھ اور ہو۔

اِحتمالِ دوم :-

آپ کی وفاتِ شریفہ بمعنی "ابانۃ الروح عن الجسد" ہی ہے لیکن بعد کا اعادۂ حیات دُخولِ رُوح سے نہیں، اِتصالِ رُوح سے ہے۔ رُوحِ مُبارک جسدِ اطہر سے جُدا ہو کر رفیقِ اعلیٰ اور حظیرۂ قدسیہ میں پہنچی، پھر اسی مستقر سے اس کا پرتو قبر شریف میں رکھے ہوئے جسدِ اطہر پر پڑنے لگا، اس سے جسدِ عنصری کا شعور بیدار ہُوا اور رُوح و بدن میں نہایت قوی علاقہ قائم ہو گیا۔ رُوح و بدن کے اس تعلق سے حیاتِ جسمانی قائم ہوئی اور روضۂ منوّرہ پر عرض کیے گئے صلوٰۃ و سلام کو آپ خود سُنتے ہیں۔

اِحتمالِ سوم :-

آپ کی وفاتِ شریفہ بمعنی "ابانۃ الروح عن الجسد" نہیں بلکہ بمعنی قبضِ رُوح ہے "انقباض الروح فی القلب" ہے۔ رُوحِ اقدس سارے جسد سے یہ موجودہ تعلق منقطع کر کے قلبِ مُبارک میں مستور ہو گئی۔ پھر وہاں رُوح اور حیات میں تلازم ہٹ گیا۔ آثارِ حیات قلبِ منوّر میں مرتکز ہو گئے اور رُوحِ مُبارک اس تعلق کے باوجود علیین سے متعلق ہو گئی۔

خلاصہ یہ کہ حیات ایک لمحہ کے لیے بھی مرتفع نہ ہوئی اور رُوح بمعنی حیات کا بالکل انقطاع نہ ہُوا خواہ رُوح مغائرِ حیات علیین ہی میں ہو۔ یاد رہے کہ اس عالم میں منتقل ہونے کے بعد رُوح و حیات میں تلازم نہیں۔ آثارِ حیات سلب ہو کر قلب میں اس لیے منتقل ہوئے کہ انتقالِ دارین کا تحقق ہو سکے، کیونکہ موت ذریعہ ہے اُس عالم میں منتقل ہونے کا اور قاعدہ ہے کہ حریمِ اسرار میں بجز آئینِ دربار کے کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے ورودِ وفات پر صحابہ کرام رض نے آپ کو دفن کر دیا اور روضۂ منوّرہ میں پھر آپ کے جسدِ اطہر میں حیات پھیلا دی گئی اور رُوح و بدن کا ویسا ہی تعلق قائم ہو گیا جیسا کہ اس دُنیا میں تھا۔ ماسوا اس کے کہ لوازمِ حیات وہاں صرف وُہی ہیں جن کا پتہ ہمیں شریعت کی

طرف سے ملتا ہے، اِس دُنیا کی زندگی کے جمیع لوازمات کا تحقق وہاں ضروری نہیں۔

طریانِ موت اور اعادۂ حیات کی ان تینوں صورتوں میں سے کوئی ایک محلِ نزاع نہیں اور نہ ان میں سے کسی ایک کے امرِ واقع ہونے پر ہمیں اصرار ہے۔ بحث و تمحیص وہیں ہونی چاہیے، جہاں ترتبِ احکام مختلف کروٹیں لے رہا ہو اور جہاں بہر صورت قدرِ مشترک ایک ہی ہو اور ترتبِ آثار و احکام میں، خواہ کوئی بھی احتمال اختیار کریں نتیجہ ایک ہی ہو، وہاں ان مباحث میں اُلجھ کر رہ جانا خود ایک اندازِ جنون ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے طریانِ موت اور اعادۂ حیات کے لیے جس صورت کو امرِ واقع قرار دیا ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ہم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے لیے ایسے یقین کے خواستگار نہیں کہ وہ ہم سنگ یقین توحید و رسالت ہو، فقط اس قدر کافی ہے کہ فقط ترتبِ آثار و احکام ہو سکے۔"

(آبِ حیات ص۲۲)

"گو عقیدہ تو یہی ہے اور میں تو جانتا ہوں انشاء اللہ العزیز ایسا ہی رہے گا، مگر اس عقیدہ کو عقائدِ ضروریہ سے نہیں سمجھتا۔"

(لطائفِ قاسمیہ ص۵ طبع مجتبائی)

پس جب حضرت حجۃ الاسلامؒ نے اپنی اختیار کردہ صورت سے اختلاف کرنے کا خود دوسروں کو حق دیا ہے تو اب اس خاص جزئیہ میں حضرتؒ سے اختلاف خود ان کے مسلک سے خروج نہیں۔ ہاں اگر قدرِ مشترک ہی کا کہ "روضۂ منورہ میں جسدِ اطہر محض بے حس و شعور نہیں، بلکہ اس میں حیاتِ عنصری بہر صورت بکیفیت موت موجود ہے" انکار کر دیا جائے تو پھر اس اصل کے انکار کو اس ایک خاص صورتِ موت کے انکار پر قیاس نہیں کر سکتے، یہ یقیناً اکابرِ اہلِ سنت کے مسلک سے گریز پائی ہے۔ روح

مبارک نے علیین سے پرتو ڈال کر جسدِ اطہر میں حیات لوٹائی ہو یا قدرتِ ایزدی سے خود روح ہی بدن میں داخل ہو چکی ہو یا قلبِ منور میں مستور حیات پھر سارے بدن میں پھیلا دی گئی ہو، صورتِ واقعہ خواہ کچھ ہو، مآلِ کار سب کا ایک ہے اور وہ یہ کہ روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی تمام احتمالات اور مسالکِ فکر کی قدرِ مشترک ہے۔

تفصیلِ مذکور سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ مسئلۂ زیرِ بحث فقط یہی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روضۂ شریفہ میں حیاتِ عنصری سے زندہ ہیں یا جسدِ اطہر محض بے جان پڑا ہے۔ یہ مبحث ہرگز نہیں کہ:-

(۱) حضورؐ پر وفاتِ شریفہ کا ورود ہوا تھا یا نہیں یا

(۲) یہ طریانِ موت "انقطاع الروح عن الجسد" کے معنی میں تھا یا قبضِ روح کے معنی میں یا

(۳) روحِ مبارک کا مستقر مقامِ علیین ہے اور وہ وہاں سے روضۂ منورہ میں رکھے جسدِ اطہر پر پرتوِ حیات ڈال رہی ہے یا خود روح ہی دوبارہ جسدِ اطہر میں داخل ہے اور رفیقِ اعلیٰ سے فقط ایک تعلق باقی ہے۔ وغیرہ ذلک من المدارک۔ ان کیفیات کو موضوع بنا لینا یقیناً خروج عن المبحث ہے اور یہ امور قطعاً نفسِ اشتراک "قبر شریف کی حیاتِ عنصری" کے عوارضِ ذاتیہ میں سے نہیں، ان احتمالاتِ ثلثہ میں سے کسی ایک یا دو کے بالکل خلافِ واقعہ ثابت ہو جانے سے بھی اصل مسئلے کا انکار یا ابطال لازم نہیں آتا۔

اصل مبحث حیاتُ النبیؐ :-

باعتبارِ تعلق بالبدن ———	حیاتِ جسمانی	مشترک مفاد حیاتِ جسمانی برزخی ہے۔
باعتبارِ تعلق بالعالم ———	حیاتِ برزخی	
باعتبارِ تعلق بالرزق ———	حیاتِ روحانی	

(ولولا الاعتبارات لبطل الحکمۃ)

حیاتِ جسمانی

زندہ اُسے ہی کہتے ہیں جس کے بدن میں حیات ہو، خواہ دخولِ روح سے، خواہ تاثیرِ روح سے۔ فقط روح کے زندہ ہونے سے کسی کو زندہ نہیں کہا جاتا، اس لیے کہ روح تو ہوتی ہی زندہ ہے، خواہ مسلمان کی ہو یا کافر کی —— روح جہاں بھی ہوگی، زندہ ہی ہوگی۔ پس کسی شخصیت کے زندہ ہونے یا نہ ہونے کا معیار جسم ہے اور یہی زندگی کا محل ہے۔ جس کے بدن میں حیات ہو وُہ زندہ ہے اور جس کی روح یا حیات اُس کے بدن سے منقطع ہے وُہ زندہ نہیں اور نہ اسے کوئی زندہ سمجھتا ہے۔

قرآنِ عزیز میں جہاں بھی انسانی حیات کا تذکرہ ہے، اُس کا محل جسم ہی ہے۔ شُہداء کے متعلق ارشاد فرمایا:-

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ ...... الآیۃ	اور تم اُنھیں، جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں، مُردے نہ کہو، بلکہ وُہ زندہ ہیں، لیکن تمھیں پتہ نہیں چلتا۔

یہاں احیاء اُنھی کو فرمایا، جو من یقتل کے ماتحت آتے تھے اور ظاہر ہے کہ قتل کا محل جسم ہے نہ کہ رُوح —— پس حیات کا محل بھی جسم ہی ہے نہ کہ رُوح —— اگر جسم میں زندگی ہو تو وُہ زندہ ہے۔ اگر جسم زندہ نہیں تو کوئی زندگی نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ شُہداء کے اجسام سامنے بالکل مُردہ نظر آتے ہیں، بلکہ بعض اوقات لاش بھی ایک جگہ نہیں ہوتی تو کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ وُہ جسمانی طور پر زندہ ہیں؟ جواباً عرض ہے کہ اسی لیے تو ربّ العزّت نے ارشاد فرما دیا تھا —— وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ لیکن تمھیں پتہ نہیں چلتا —— اگر ہمیں اس حیات کا پتہ نہیں چلتا، تو یہ ایک پردہ ہے، حق یہی ہے کہ حیات ثابت ہے اور وُہ جسمانی حیات ہے کہ قاضی

شوکانیؒ لکھتے ہیں:۔

وورد النص في كتاب الله في حق الشهداء انهم احياء يرزقون وان الحياة فيهم متعلقة بالجسد فكيف بالانبياء المرسلين۔

(نیل الاوطار جلد ۳ صـ۲۱۱ مصر)

نصِ قرآن وارد ہے کہ شہداء زندہ ہوتے ہیں، انھیں رزق بھی دیا جاتا ہے اور یہ کہ ان کی حیاتِ جسمانی ہوتی ہے (خواہ ہمیں اس کا ادراک نہ ہوتا ہو)۔ پس انبیائے مرسلین کی حیات پھر کس طرح جسمانی نہ ہوگی!

(۲) وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى

(پ ۳ بقرۃ)

اور جب ابراہیمؑ نے کہا "اے پروردگار! مجھے دکھائیے کہ آپ کس طرح مردوں کو زندہ فرماتے ہیں"۔

یہاں حیات کا محل اسے ہی بنایا ہے کہ "موتیٰ" کہا گیا ہے اور ظاہر ہے روح ہمیشہ زندہ ہوتی ہے اسے میت کبھی بھی نہیں کہا جاتا۔ موت کا محل جسم ہی ہے اور "موتیٰ" اجسام ہی کو کہا گیا ہے۔ پس حیات کا محل بھی جسم ہی ہے نہ کہ روح۔

(۳) فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ

حضرتِ عزیرؑ کو سو سال تک[1] موت سے رکھا۔

اس میں بھی اماتت کا محل "جسم" ہی ہے نہ کہ روح۔ حضرتِ عزیرؑ کی روح پر

۱؎ پیشِ نظر رہے کہ جس طرح جملہ بنی آدم پر فعلِ اماتت محض ایک آنی اور صرف چند لمحات کے لیے وارد ہوتا ہے بعد ازاں برزخی معاملات شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت عزیرؑ پر ایسا نہ ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سو سال تک موت کی حالت ہی میں رکھا؛ آگے کے برزخی معاملات ان پر وارد نہ فرمائے، کیونکہ آگے جا کر انھیں اسی دنیا میں زندہ کیا جانا تھا۔ پس جب سابقہ سے انتقالِ دارین کا تحقق نہ تھا، تو برزخی معاملات کو روک لیا گیا۔ یہاں "مائۃ عام" کی قید اسی لیے ہے کہ جب دوسرے بنی آدم پر فعلِ اماتت کے بعد معاملاتِ برزخ جاری کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں معاملہ عجیب ہو رہا ہے۔ پس اسے ایک ضابطہ بنانا اور موتِ انبیاءؑ کے لیے بطور ایک کلیہ کے پیش کرنا کس قدر کھلی غلطی ہے!

تو موت قطعاً نہ آئی تھی۔ پس جس طرح موت کا محل جسم ہے نہ کہ رُوح۔ اسی طرح حیات کا محل بھی جسم ہی ہے۔ جب حیات جسم میں ہو تو زندہ ہے جب نہ ہو تو زندہ نہیں۔

(۴) انّٰی یحیی ھذہ ـــــ میں بھی محل حیات جسم ہی ہے نہ کہ رُوح۔

اِن حقائق سے واضح ہے کہ حیات ہوتی ہی جسمانی ہے، اگر رُوح کا تعلق بدن کے ساتھ نہ ہو تو اسے کوئی حیات نہیں کہتا اور نہ ہی یہ حیات کی کوئی قسم ہے۔ خواہ مخواہ اسے حیاتِ رُوحانی کہتے چلے جانا ایک مغالطہ اور فریب ہے، اسی طرح موت کا محل بھی جسم ہی ہے۔ مالک بن ریب اپنے مرثیے میں کہتا ہے ۔ ؎

وَ لَمَّا تَرَاءَتْ عِنْدَ مَرْوٍ مَنِيَّتِي
وَحَلَّ بِهَا جِسْمِيْ وَحَانَتْ وَفَاتِيَا

(ترجمہ) اور جب مرو کے پاس میری موت سامنے آئی اور اس کا محل
میرا جسم بنا اور میری وفات کی گھڑی آپہنچی۔

حیاتِ برزخیہ

انبیائے کرامؑ کی حیاتِ عنصری جسمانی کے انکار کو حیاتِ برزخی کے مبہم اقرار میں لپیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ حیات کی کوئی قسم برزخی نہیں۔ حیاتِ برزخیہ میں علاقہ ذعیت کا نہیں ظرفیت کا ہے اور حیاتِ برزخی سے مُراد حیات فی البرزخ ہے نہ یہ کہ حیات کی اپنی کوئی قسم برزخی ہے، نہ یہ مطلب ہے کہ آپ کو عالمِ برزخ میں حیاتِ جسمانی حاصل نہیں۔

پس جن جن بزرگوں نے حیاتِ برزخی کی تصریح کی ہے اُن کی مراد روضۂ منورہ کی حیاتِ عنصری جسمانی کا انکار ہرگز نہیں۔ اسی طرح جنھوں نے حیاتِ رُوحانی کے

الفاظ استعمال کیے۔ اِن کا منشاء یہی تھا کہ باعتبار تعلق بالبرزخ وہ رُوحانی حیات ہے، نہ یہ کہ حیات کی کوئی اپنی قسم رُوحانی بھی ہے۔ اندریں صورت حیاتِ رُوحانی یا حیاتِ برزخی کے قول سے قبرِ شریف کی حیاتِ جسمانی کا انکار ہرگز لازم نہیں آتا۔

خلاصۃ المرام یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ثانیہ کی اِن جہات (برزخی، رُوحانی، معنوی) میں کوئی اختلاف نہیں، انھیں خواہ مخواہ محلِ بحث بنانا اصل موضوع کو اُلجھانے کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اصل موضوعِ تحقیق صرف حیاتِ جسمانی ہے اور وہی محلِ نزاع بنی ہوئی ہے۔ پس اصل مبحث یہ ہے کہ:-

"سید الکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے روضۂ شریفہ میں حیاتِ عنصری جسمانی حاصل ہے یا جسدِ اطہر محض بے حس و شعور پڑا ہے"۔ (معاذ اللہ)

رُوح کی حقیقت

بقیۃ السلف بحر العلوم حضرتِ علامہ سید انور شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بالفاظِ عارف جامیؒ یہاں تین چیزیں ہیں:-

۱- وہ جواہر جن میں مادہ اور کمیت دونوں ہوں، جیسے ہمارے ابدانِ مادیہ۔

۲- وہ جواہر جن میں مادہ نہیں صرف کمیت ہے، جنھیں صوفیا "اجسامِ مثالیہ" کہتے ہیں۔

۳- وہ جواہر جو مادہ اور کمیت دونوں سے خالی ہوں، جن کو صوفیہ "ارواح" یا حکماء "جواہرِ مجردہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔

جمہور اہلِ شرع جس کو رُوح کہتے ہیں، وہ صوفیہ کے نزدیک "بدنِ مثالی" سے موسُوم ہے، جو بدنِ مادی میں حلول کرتا ہے اور بدنِ مادی کی طرح آنکھ، ناک، کان، ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء رکھتا ہے۔ یہ رُوح بدنِ مادی سے کبھی جُدا ہو جاتی ہے اور اِس

جدائی کی حالت میں بھی ایک طرح کا مجہول الکیفیت علاقہ بدن کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے، جس سے بدن پر ہر حالت میں موت طاری نہیں ہونے پاتی، گویا حضرت علی مرتضیٰؓ کے قول کے مطابق، جو بغویؒ نے "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا" کی تفسیر میں نقل کیا ہے، اس وقت روح خود علیحدہ رہتی ہے، مگر اس کی شعاع جسد میں پہنچ کر بقائے حیات کا سبب بنتی ہے، جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے۔ (فوائد القرآن للعلامۃ العثمانیؒ ص ۶۷۸)

حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

الحیوٰۃ فی اللغۃ شیءٌ مغائر للروح لا عینہ بل ثمرۃ تعلقہ وقد زعم بعض الناس انہ نفس الحیوٰۃ ولیس کذٰلک۔ (تحیۃ الاسلام ص ۳۶)	حیات اور روح لغت کی رو سے دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ حیات روح کا عین نہیں، بلکہ اس کے تعلق کا ایک ثمرہ ہے۔ بعض عام لوگوں کا گمان ہے کہ روح ہی نفس حیات ہے، حالانکہ معاملہ ایسا نہیں۔
بسیارے از اشاعرہ وحنفیہ در اعادۂ روح تردد کردہ اند و تلازم روح وحیات را منع نمودہ۔ (بجذب القلوب ص ۱۹۹ لذ مسائرہ)	بہت سے اشاعرہ اور حنفیہ (حیات فی القبر کے لیے) اعادۂ روح کے باب میں متردد رہے ہیں (یعنی اسے قطعی نہیں جانتے رہے) اور حیات اور روح کے تلازم کے قائل نہیں (یعنی قبر میں حیاتِ جسمانی کے لیے اعادۂ روح ضروری نہیں، محض تعلقِ روح سے بھی وہاں حیات کا تحقق ہو جاتا ہے)۔

مفارقتِ بدن کے بعد رُوح کا شعور

امام رازیؒ اس پر دلائل پیش کرتے ہوئے کہ روح مفارقت بدن کے بعد بھی جزئیات کا ادراک کر سکتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فوجب القطع بأن النفس بعد مفارقة البدن مدركة للجزئيات"۔ (المطالب العالیہ مقالہ ۳، فصل ۲، مطبوعہ مصر)

ان تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ اصل موضوع "اعادۂ روح" بھی نہیں، بلکہ "ثبوتِ حیات بعد الوفات لسید الکائنات" ہے۔ اسی موضوع پر ہم کچھ گزارشات کرنا چاہتے ہیں، عودِ روح کی بحث اگر آئے گی، تو ضمناً آئے گی۔ واللہ ولی التوفیق وبیدہ ازمۃ التحقیق!

حیات بعد الوفات لسید الکائنات

الباب الاول وفیه اربعة فصول

حدثنا ھارون بن عبد اللہ اخبرنا حسین بن علی عن[1] عبد الرحمٰن بن یزید بن جابر عن ابی الاشعث الصنعانی عن اوس بن اوس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من افضل ایامکم یوم الجمعة فیه خلق آدم وفیه قبض وفیه النفخة وفیه الصعقة فاکثروا علیّ من الصلوٰة فان صلوٰتکم معروضة علیّ قال قالوا یا رسول اللہ وکیف تعرض صلوٰتنا علیک وقد ارمت قال یقولون بلیت فقال ان اللہ عزوجل حرم علی الارض اجساد الانبیاء۔

سنن ابی داؤد جلد ۱ ص ۱۵۰، سنن نسائی جلد ۱ ص ۲۱۴، ۱۵۴ سنن ابن ماجه ص ۷۷، ۱۱۹، سنن دارمی ص ۱۹۵ مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۲۷۸، سنن کبریٰ بیہقی جلد ۳ ص ۲۴۸ والطبرانی کما فی نیل الاوطار جلد ۳ ص ۲۱۰، ۲۱۱ واحمد کما فی التفسیر لابن کثیر جلد ۳ ص ۵۱۵ وابن خزیمة وابن حبان وسعید بن منصور فی سننه وابن ابی شیبة فی مصنفه کما فی شرح العلامة البوسنوی ص ۸ مصر۔

---

[1] قال ابن حبان فی صحیحه حدثنا ابن خزیمة حدثنا ابو کریب حدثنا حسین بن علی حدثنا عبد الرحمٰن بن یزید بن جابر فصرح بالسماع منه (جلاء الافہام للحافظ ابن القیم ص ۳۴ طبع امرتسر)۔

(ترجمہ) حضرت اوس بن اوس رضی کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تمام دنوں میں سے افضل جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم کی تخلیق ہوئی، اسی دن ان کی روح قبض ہوئی۔ اسی دن صور پھونکا جائے گا اور اسی دن قیامت کی بے ہوشی ہوگی۔ پس جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو، کیونکہ تمہارا درود بے شک مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہ رضی نے عرض کی کہ یا رسول اللہ، جب آپ قبر میں گھل چکے ہوں گے تو اس وقت ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ ربّ العزت نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاء کے جسموں کو مٹی بنائے۔

اس حدیثِ صحیح میں منشاء نبوت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے یہ امور پیشِ نظر رکھیں:۔

ا۔ صحابہ کرام رضی کا یہ سوال کہ بعد الوفات ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا، دراصل آں حضرت کے اس ارشاد سے پیدا ہوا تھا ——

فان صلوٰتکم معروضۃ علی ۔۔ بے شک تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت یہ ارشاد فرما رہے تھے، اس زندگی میں یہ صلوٰۃ و سلام بلا ریب روح مع الجسد پر پیش ہوتا تھا۔ اس حیات میں تو یہ تصوّر بھی نہیں کہ روح اور جسم کبھی ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہوں، اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ بعد الوفات یہ عرض صلوٰۃ و سلام صرف روحِ مجرّد پر ہوگا یا بدستور روح مع الجسد ہی پر پیش ہوتا رہے گا۔ آں حضرت کا ارشاد فان صلوٰتکم معروضۃ علیّ جملہ اسمیہ میں تھا۔ صحابہ رضی نے جب اس استمرار پر متعجب ہو کر قبل الوفات اور بعد الوفات میں فرق معلوم کرنا چاہا تو آپ نے ہر مد میں فرق کرنے کے بجائے ایک اصولی بات بتا دی کہ پیغمبروں کی وفات کے بعد وہ حالت نہیں ہوتی، جو عام وہ ہے انسانوں کی ہوتی ہے، آپ نے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا وہ اسی کا جواب تھا، ارشاد ہوا:۔

"زمین پر حرام ہے کہ انبیاء کے جسموں کو مٹی کھائے۔"

گویا آپ نے قبل الوفات اور بعد الوفات کے عرض صلوٰۃ وسلام کو برابر رکھا۔ اب ظاہر ہے کہ قبل الوفات یہ عرضِ صلوٰۃ وسلام رُوح مع الجسد پر پُورے شعُور سے ہوتا تھا پس اس یقین سے چارہ نہیں کہ بعد الوفات بھی یہ عرضِ صلوٰۃ وسلام بمع الجسد پر پُورے ادراک وشعور سے ہو رہا ہے، ورنہ بنائے سوال اور جواب میں کوئی تطابق نہیں رہتا۔

(۲) آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد کہ "زمین پر حرام ہے کہ انبیاؑ کے جسموں کو مٹی بنائے" صرف اَرَمْتَ (آپ مٹی میں گھُل چکے ہوں گے) کے مقابلہ میں نہیں، بلکہ کیف تعرض صلٰوتنا علیك کے جواب میں ہے، یعنی ارشادِ نبوت صرف یہ نہیں کہ انبیائے کرامؑ کے اجسادِ مطہرہ مٹی کے ساتھ مٹی نہیں ہوتے، بلکہ آپ کا منشاءِ یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ کے اجسادِ مطہرہ اس طرح محفوظ رہتے ہیں کہ ان پر صلوٰۃ وسلام برابر پیش ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ اصل سوال یہ تھا:۔

کیف تعرض صلٰوتنا علیك وقد ارمت - ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا جب کہ آپ مٹی میں گھل چکے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ یہاں جواب میں یہ مُراد ہرگز نہیں کہ اجسامِ مطہرہ صرف اس طرح محفوظ ہیں کہ اپنی اپنی قبور میں محض بے حس وشعور پڑے ہیں، بلکہ منشاء سوال میں ایسی محفوظیت مُراد ہے کہ ان پر صلٰوۃ وسلام پیش ہو سکے۔ اگر اجسادِ محفوظہ پر صلوٰۃ وسلام پیش نہ ہوتا ہو اور انھیں اس صلوٰۃ وسلام کا بالکل شعور نہیں رہتا تو حدیث کے دونوں جملوں میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ سوال وجواب کا اقتضاء یہی ہے کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جسدِ اطہر محض بے حس وشعور اگراً محفوظ نہ ہو، اس میں ایسی حیات ہو کہ اس پر صلوٰۃ وسلام پیش ہو سکے۔

۳۔ صحابہ کرامؓ کے سوال میں "اَرمت" اور اُس کے جواب میں "اجساد الانبیاءؑ" کے اطلاقات قطعاً اور یقیناً اس دُنیا والے جسدِ عنصری سے متعلق ہیں۔ یہاں اس شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں کہ شاید اجسادِ مثالیہ مُراد ہوں، پس اس

یقین سے چارہ نہیں کہ صلوٰۃ وسلام روضۂ منوّرہ کے اسی جسدِ عنصری پر پیش ہو رہا ہے اور جسدِ اطہر وہاں مع الرّوح ہی ہے، تو عرضِ صلوٰۃ وسلام کا محل بنا ہوا ہے، محض بے جان جسم پر درود پیش کرنے کا تو کوئی معنی ہی نہیں۔ اگر اس کا کچھ اِمکان بھی ہوتا کہ بے جان بدن یا اجزاے بدن پر بھی عرضِ صلوٰۃ وسلام ہو سکتا ہے، تو صحابہ کرامؓ کبھی یہ سوال پیدا نہ کرتے :۔

کیف تعرض صلوٰتنا علیك وقد ارمت

اگر بے جان بدن پر ہی یہ عرضِ صلوٰۃ وسلام ہے، تو پھر سارے بدن کے یک جا ہونے یا ذراتِ بدن کے منتشر ہونے میں کیا فرق ہے۔ فتفکّر فان ذالك من مدارك الاذکیاء۔

مولانا محمد بشیر قنوجیؒ تفہیم المسائل فارسی ص۸۵ پر اس حدیث حفظِ اجساد سے اسی طرح استدلال فرما رہے ہیں۔

کثیفہ

بعض حیران کن واقعات یا تصورات جب لطفِ طبع کے لیے کہے یا سنے جاتے ہیں، تو انھیں لطیفہ کہتے ہیں۔ ایسے لطائف اچھے خاصے ذوقِ طبع کا سامان ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے ہی بعض اوقات جہالت کی انتہا، نظر کے فریب یا تاویل کے فساد کو بھی علمی لطیفوں کے طور پر ذکر کر دیتے ہیں، جو واقعہ ہم عرض کرنا چاہتے ہیں وہ بھی فسادِ تاویل کی انتہائی مثال ہے۔ چونکہ اسے نقل کرنے میں بھی طبیعت پر گرانی ہوتی ہے، اس لیے اسے لطیفہ کے بجائے کثیفہ کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے :۔

پچھلے چند ماہ کا واقعہ ہے ایک تقریر کے سلسلہ میں ضلع کیمبلپور جانا ہوا۔ وہاں چند روز پہلے کے ایک جلسہ کی روئداد بعض لوگوں سے سننے کا اتفاق ہوا۔ ایک عالم نے اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ قبور میں اجساد کا محفوظ رہنا نبوّت

صادقہ کی علامت ہے، سچّے مدّعی نبوّت اور جھوٹے مدّعی نبوّت کا اس طرح سے پتہ چل سکتا ہے کہ قبر کھول کر دیکھ لو، جھوٹے مدّعی کی لاش گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہو گی، مگر سچّے پیغمبر کا جسد بالکل محفوظ ہو گا۔ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد فرمانا کہ "زمین پر حرام ہے کہ پیغمبروں کے جسموں کو کھائے" سچّے اور جھوٹے نبیوں کا امتیاز کرنے کے لیے تھا۔ (معاذاللہ!) اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ قبروں کو کھول کھول کر سچّے نبیوں کی پہچان ہوتی ہے، معاذاللہ، ثمّ معاذاللہ!

اگر یہ بیانِ دلفگار صحیح ہے، تو غور کیجیے کہ کس طرح منشائے نبوّت کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ارشادِ نبوّت کو سیاق و سباق سے بے نیاز کرنے اور اُسے ایسا معنی پہنانے پر، جو آج تک کسی شارحِ حدیث کو نہیں سُوجھا، حیرت در حیرت ہوتی ہے ؎

الا یا قومنا انتبھوا فانا
نحاسب فی القیمۃ غیر شک

اگرچہ یہ ارشادِ نبوّت، اجسادِ انبیاؑء کی محفوظیت ——، ایسی محفوظیت مکہ اس پر صلوٰۃ و سلام پیش ہو سکے —— اور ایسا صلوٰۃ و سلام پیش ہونا جیسا کہ قبل الوفات ہوتا تھا، یعنی رُوح و جسد کے مجموعے پر —— پر دلیل ناطق اور شاہدِ صادق ہے تاہم تائید مزید کے لیے یہ بھی سُنیے :-

تائیدِ مزید

سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوالدرداءؓ سے یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ حضورِ انورؐ نے ارشاد فرمایا :-

ان اللہ حرّم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی اللہ

حی یرزق ـــــ ابن ماجہ ص ۱۱۹

ترجمہ :- "بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاءؑ کے جسموں کو مٹی بنائے، پس اللہ کا پیغمبر زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی ملتا ہے"۔

یہی مضمون حضرت اوس بن اوسؓ کی روایت سے اس طرح ثابت ہوتا تھا۔

فان صلوٰتکم معروضۃ علی ـــــ بنائے سوال "کیف تعرض صلوٰتنا علیک وقد ارمت"۔

ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء ـــــ جواب برائے صورت "عرض صلوٰۃ وسلام بعد الوفات"

نتیجہ ـــــ بعد الوفات حیات جسمانی

حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت میں وہی نتیجہ خود الفاظِ نبوت ہو کر سامنے آگیا ہے۔

فنبیّ اللہ حي یرزق ـــــ اللہ کا پیغمبر زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی ملتا ہے۔

اس جزو کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ مدرج من الراوی ہے۔ محدثین میں سے کسی کی یہ تصریح ہماری نظر سے نہیں گزری۔ یہ ادعاءِ ادراج اور حکمِ ادراج کہاں تک صحیح ہے، یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں، ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ انبیاءؑ کے اجسادِ مطہرہ کے محفوظ رہنے اور ان پر صلوٰۃ وسلام کے پیش ہوتے رہنے سے، حیاتُ النبیؐ کا جو استدلال ہم نے پیش کیا ہے، وہ دوسری روایت میں بعینہٖ جزوِ حدیث کے طور پر موجود ہے اور اگر یہ راویِ حدیثؒ کی اپنی تفسیر اور ادراج ہے تو بھی اس میں ہماری ہی تائید ہے کہ حدیثِ حفظِ اجساد کا اس کے پورے سیاق وسباق کے ساتھ، جو مطلب ہم نے سمجھا تھا، اس حدیث کے راوی

لہ کما یظهر من صنیع صاحب السیرۃ المحمدیۃ ورا جع لہ ص ۵۴

کرنے والے بھی وہی مطلب رہے ہیں، مقام تعجب ہے کہ اجساد الانبیاءؑ کے واضح سیاق کے باوجود فنبی اللہ حی یرزق کا مطلب یوں بیان کیا جائے کہ اس میں مطلق حیات کا ثبوت ہے حیاتِ جسدی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے

والبغی یصرع اهله   والظلم مرتعه الوخیم

حضرت ابو الدرداءؓ کی یہ روایت ایک اور سلسلۂ اسناد سے طبرانی میں بھی موجود ہے (جلاء الافهام لابن القیم ص۵۰)

رجال اسناد روایت ابی الدرداءؓ

۱۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ← قلت رجاله ثقات (تهذیب جلد ۳ ص۳۹۸)۔

۲۔ الحفنی حاشیہ عزیزی شرح جامع صغیر ← رجاله ثقات۔ ص۲۹ مصر۔

۳۔ ملا علی قاریؒ ← باسناد جید نقله میرکؒ عن المنذری وله طرق کثیرة (مرقاة جلد ۲ ص۱۱۲)۔

۴۔ علامہ سمہودیؒ ← رواه ابن ماجة باسناد جید (خلاصة الوفاء ص۴۸)۔

۵۔ قاضی شوکانی یمنیؒ ← اخرج ابن ماجة باسناد جید (نیل الاوطار جلد ۳ ص۲۱۰)۔

۶۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ ← باسناد جید (عون المعبود جلد ۱ ص۴۰۵)۔

۷۔ تنقیح الرواة ص۲۵۵ باسناد جید (وترکنا البقایا مخافة التطویل)۔

الفصل الاوّل

وفیه ستّة من المباحث

المبحث الاوّل: احوالِ رواۃ حدیث اوس بن اوس رضؓ

پہلا راوی، جس پر تمام ائمۂ حدیث کا اشتراک ہو جاتا ہے، حسین بن علی الجعفی ہے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر، پھر ابوالاشعث صنعانی اور ان کے بعد حضرت اوس بن اوس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ اندریں صورت صرف حسین بن علی، عبدالرحمٰن اور ابوالاشعث کے مختصر تراجم پیش کیے جاتے ہیں۔

حسین بن علی —— ثقة عابد (تقریب ص۱۱۳، کشف الاستار ص۲۶)۔

عبدالرحمٰن بن یزید:—

عبدالرحمٰن بن یزید دو ہیں: ایک عبدالرحمٰن بن یزید بن تمیم۔ دوسرے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر۔ ابن تمیم کو ضعیف کہا گیا ہے، لیکن ابن جابر ثقہ اور قوی ہے۔ اس حدیث کے سلسلۂ اسناد میں عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ہے، ابن تمیم نہیں۔ بعض حضرات نے ان اسانید کو دیکھ کر جہاں صرف عبدالرحمٰن بن یزید تھا، اسے ابن تمیم سمجھ لیا اور حدیث کی تضعیف کر دی، حالانکہ ابوداؤد اور نسائی کے متن میں ابن جابر کی تصریح موجود ہے۔

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ بعض لوگ ان دونوں کو خواہ مخواہ خلط ملط کر رہے ہیں

لہ قال ابوداؤدؒ حدثنا ھارون بن عبداللہ اخبرنا حسین ابن علی (جلد ا ص۱۵۰)۔ قال النسائیؒ اخبرنا اسحق بن منصور قال حدثنا حسین ابن علی (جلد ا ص۱۵۰)۔ قال احمد حدثنا حسین بن علی (ابن کثیر جلد ۳ ص۱۵۰)۔ قال ابن ماجہ حدثنا ابوبکر بن ابی شیبہ حدثنا حسین بن علی (ص۱۱۹)۔ قال ابن خزیمہ حدثنا ابوکریب حدثنا حسین بن علی حدثنا عبدالرحمٰن (جلاء الافہام لابن القیم ص۲۶)۔

جن لوگوں کی رسائی اصل کتبِ حدیث تک نہیں ہوتی، اُن کی ناواقفیت کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر، انھیں مغالطہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ نچلے راوی حسین بن علی نے یُوں ہی ابنِ جابر کہہ دیا ہے (معاذاللہ، استغفراللہ!)۔ ضد اور تعصب نے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ ہر صداقت مشتبہ نظر آتی ہے ؎

وقد ترکتنی لا اعی لمحدث
حدیثاً و ان ناجیتہ و نجانی

سُنیے حافظ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں :۔

وقولھم انہ ظن انہ ابن جابر وانما ھو ابن تمیم فغلط فی اسم جدہ بعید فانہ لم یکن یشتبہ علی حسین ھذا بھذا مع نقدہ وعلمہ بھما وسماعہ منھما۔ (جلاء الافہام ص۴۴)

بعض لوگوں کا یہ گمان کہ یہ راوی ابنِ تمیم ہے، اسے ابنِ جابر کہنے میں غلطی ہوگئی ہے، صحیح نہیں۔ حسین بن علی جیسے راویِ حدیث پر ایسا شک بہت بعید ہے۔ حسین بن علی کا معیارِ تنقید اور ان دونوں عبدالرحمٰن نامی راویوں کو ذاتی طور پر جاننا اور ان سے سننا ہرگز اس اشتباہ کی گنجائش نہیں دیتا۔

رأیت الدار قطنی قد ذکر ذلک نصًا (ص۴۸)

عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر نے مکحول، زہری، عطیہ بن قیس، عُمیر بن ہانی، ابوالاشعث صنعانی اور عطاء خراسانی سے احادیث سُنیں اور اُن سے ان کے بیٹے عبداللہ، حسین بن علی الجعفی اور دُوسرے کئی لوگوں نے روایات لیں، آپ امیرالمؤمنین فی الحدیث حضرت عبداللہ بن المبارک کے بھی شیخِ حدیث تھے (جلاء الافہام ص۴۴)۔

امام یحییٰ بن معین، ابنِ سعد، امام نسائی اور دُوسرے کئی محدثین نے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کو ثقہ قرار دیا ہے (تہذیب جلد ۶ ص۲۹۸)۔

ابن المدینی کہتے ہیں کہ یہ صحابہؓ کے بعد فقہائے شام کے دوسرے طبقہ میں سے تھے۔ یعقوب بن سفیان کہتے ہیں کہ جابر کے بیٹے عبدالرحمٰن اور یزید دونوں ثقہ تھے۔ ابوداؤد کہتے ہیں "هو من ثقات الناس"۔ ان کے بیٹے ابوبکر نے کہا ہے "ثقة مأمون"۔ ابوحاتم کہتے ہیں "صدوق لا بأس به ثقة" (تہذیب جلد ۶ ص ۲۹۸)۔

وفات ۱۵۳ھ عمر تقریباً ۸۴ سال۔ ابن جابر کے اساتذہ میں ابوالاشعث الصنعانی کا اسم گرامی ذکر ہو چکا۔ یہی استاذ اس حدیث حفظِ اجسادِ انبیاءؑ کو روایت کر رہے ہیں۔ ابن تمیم کے اساتذہ میں کہیں ابوالاشعث کا نام نہیں ملتا۔ (تہذیب ص ۲۱۵ من المجلد السادس)۔

پیشِ نظر رہے کہ وہ شخص، جسے عبدالرحمٰن بن یزید کے دادا کے نام پر اشتباہ ہوا اور ابن تمیم کے بجائے ابن جابر کہہ گیا تھا، درحقیقت ابواسامہ ہے، حسین بن علی نہیں اس پر عللِ رجال کے ماہرِ فن امام دارقطنی نے نص فرمائی ہے۔

خلاصۂ کلام یہی ہے کہ یہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ہے اور ثقہ صدوق راویِ حدیث ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ وہ لوگ، جو طبقاتِ رواۃ اور عللِ رجال پر نظر نہیں رکھتے، از خود جرح و تعدیل میں امام بن بیٹھتے ہیں۔

ابوالاشعث الصنعانی:

ثقة من الثانية شهد فتح دمشق (تقريب التهذيب ص ۲۳۱)۔ اصل نام شراحیل بن آدہ ہے۔ ثقہ راویِ حدیث ہے (کشف الاستار ص ۱۱۹)۔

المبحث الثانی

کن کن ائمۂ کبار اور محدثینِ کرام نے اس حدیث کی تصحیح فرمائی ہے اور اسے تسلیم کیا ہے:-

۱ - امام احمدؒ ۲ - امام ابوداؤدؒ ۳ - امام نسائیؒ ۴ - امام ابنِ حبانؒ ۵ - امام ابنِ خزیمہؒ ۶ - امام دارقطنیؒ ۷ - امام نوویؒ ۸ - امام ابنِ دحیہؒ ۹ - حافظ ابنِ کثیرؒ ۱۰ - حافظ ابن تیمیہؒ ۱۱ - حافظ ابنِ قیمؒ ۱۲ - حافظ ذہبیؒ ۱۳ - حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ ۱۴ - علامہ عینیؒ ۱۵ - حافظ سخاویؒ ۱۶ - علامہ طیبیؒ ۱۷ - امام مُلّا علی قاریؒ ۱۸ - علامہ سمہودیؒ ۱۹ - شیخ دہلویؒ ۲۰ - قاضی شوکانیؒ ۲۱ - حجۃ الاسلام امام محمد انور شاہ کشمیریؒ وغیرہم من الاکابر رحمہم اللہ تعالیٰ -

حوالجات از بعض عبارات :-

۱ - شیخ الاسلام حافظ ذہبیؒ ـــــ تلخیص المستدرک للعلامۃ الذہبی "علیٰ شرط البخاری" جلد ۱ ص ۲۷۸

۲ - حضرت امام نوویؒ :-

روینا فی سنن ابی داؤد والنسائی وابن ماجہ بالاسانید الصحیحۃ عن اوس بن اوسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم .... الحدیث (کتاب الاذکار کتاب الصلوٰۃ علیٰ رسول اللہؐ ص ۱۲۸) -

۳ - خاتمۃ الحفاظ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ :-

أ - ورد الامر باکثار الصلوٰۃ علیہ یوم الجمعۃ من حدیث اوس بن اوسؓ وھو عند أحمد وابی داؤد وصححہ ابن حبان (فتح الباری پ ۲۶ کتاب الدعوات ص ۵۵ مطبوعہ دھلی)

ب - ورد الامر بالاکثار منھا یوم الجمعۃ فی حدیث صحیح کما تقدم (فتح الباری پ ۲۶ ص ۵۸) -

ج - عند ابی داؤد والنسائی وصححہ ابن خزیمۃ وغیرہ عن

اوس بن اوس رض رفعہ۔

(فتح الباری پ ۱۳ کتاب الانبیاء ص ۲۷۹)

۴۔ شیخ الاسلام علامہ عینیؒ :۔

صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض لا تأکل اجساد الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام (عینیؒ علی البخاری جلد ۶ ص ۴۹)

۵۔ حافظ ابن کثیرؒ :۔

قد صح ھذا الحدیث ابن خزیمۃ وابن حبان والدارقطنی والنووی فی الاذکار (تفسیر لابن کثیر ص ۵۱۴/۳)

ان پانچوں حوالوں کا خلاصہ یہی ہے کہ حضرت اوس بن اوسؓ کی یہ روایت کہ انبیاء کرامؑ کے جسموں کو اللہ تعالیٰ نے مٹی پر حرام کر دیا ہے اور یہ کہ ان پر صلوٰۃ وسلام پیش ہوتا رہتا ہے، بالکل صحیح الاسناد ہے اور یقیناً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے۔

۶۔ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :۔

ومن تأمل ھذا الاسناد لم یشك فی صحتہ لثقۃ رواتہ وشہرتہم وقبول الائمۃ حدیثہم (جلاء الافہام ص ۴۲)	اور جس نے بھی اس حدیث کی سند میں غور کیا اسے اس حدیث کی صحت میں کوئی شک نہ رہا، کیونکہ اس کے سب راوی ثقہ اور مشہور ہیں اور ائمہ حدیث نے ان سب کی روایات قبول کی ہیں۔ آں
قد صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الارض لا تأکل اجسام الانبیاء ..... الی غیر ذلک مما یحصل من جملتہ القطع	حضرتؐ سے صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ زمین انبیاء کرامؑ کے جسموں کو نہیں کھاتی۔ ایسے دلائل سے یہ بات قطعی طور پر

بأن موت الانبیاء انما هو راجع الی ان غیبوا عنا بحیث لاندرکهم وان کانوا موجودین احیاء (کتاب الروح ص۴۳)

ثابت ہو جاتی ہے کہ انبیائے کرامؑ کی موت کا معنی یہ ہے کہ وہ ہم سے اس طرح غائب کر لیے گئے ہیں کہ ہم ان کا ادراک نہیں کرتے ورنہ وہ تو موجود اور زندہ ہیں۔

۷۔ امام الحدیث والفقہ ملا علی قاری علیہ رحمۃ ربہ الباری :-

قال میرک ورواہ ابن حبان فی صحیحہ والحاکم وصححہ وزاد ابن حجر بقولہ وقال صحیح علی شرط البخاری ورواہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ قال النووی اسنادہ صحیح وقال المنذری لہ علۃ دقیقۃ[1] اشار الیہا البخاری نقلہ میرک قال ابن دحیہ انہ صحیح بنقل العدل عن العدل ومن قال انہ منکر او غریب بعلۃ خفیۃ فقد استروح لان الدارقطنی ردھا۔ (مرقاۃ جلد ۲ ص۲۰۹ مصر)

یعنی جس شخص نے اس حدیث کو "منکر" یا "غریب و معلل" کہا ہے، اس نے نہایت لچر بات کہی، کیونکہ امام دارقطنی جیسے ماہر فن نے اس علت کو مردود قرار دیا ہے۔

۸۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ :-

در حدیث صحیح آمدہ کہ بسیار گوئید در روز جمعہ درود بر من زیرا کہ صلوٰۃ شما معروض می گردد بر من۔ ازیں جا معلوم می شود کہ حیات انبیاء حیات جسمی

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی حیات اس دنیا والے جسم

---

[1] یہ علت غالباً عبدالرحمٰن بن یزید کے ابن تمیم یا ابن جابر ہونے کی وجہ سے ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ہے، ابن تمیم نہیں، جو محل جرح تھا۔ پس سند بالکل بے غبار رہی واجاب الحافظ عما ذکر فیہ من العلۃ وراجع لہ جلاء الافہام ص۷۵، ۷۶۔

دُنیاوی است نہ مجرد بقاے ارواح۔۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۴۲۰) — سے ہے، نہ کہ فقط ارواح کے زندہ رہنے سے۔

۹۔ قال الحافظ عبد الغنی النابلسی انه حسن صحیح (ترجمان السنة ۳ صفحہ ۲۹۷)۔

۱۰۔ خاتم المحدثین حضرت العلامہ امام محمد انور شاہ کشمیریؒ :-

ومما کفر به الفقهاء الحجاج۔۔ ۔۔۔۔۔ لان فی هذا الکلام تکذیبًا لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نعوذ باللّٰه من اعتقاد ذلك فانه صح عنه صلی اللّٰه علیه وسلم انه قال ان اللّٰه عز وجل حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء رواه ابو داؤد۔ (خزائن الاسرار صفحہ ۱۹)

فقہاے کرام نے جن وجوہ کی بنا پر حجاج کی تکفیر کی تھی، ایک ان میں سے یہی ارشادِ پیغمبرؐ کی تکذیب بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاے کرامؑ کے جسموں کو کھائے۔ کیونکہ یہ حدیث آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر ثابت ہو چکی ہے اور اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

تلك عشرة کاملة!

المبحث الثالث

اُن بزرگوں کی عبارات، جنھوں نے اِس حدیث کا مطلب روضۂ منورہ کی حیات یقین کیا ہے[۱]

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم — جنید و شبلی و عطار ہم مست

---

[۱] وراجع له الکامل للمبرد جلد ۱ صفحہ ۱۹۰ بحاشیة الدکتور زکی مبارک وجلد ۱ صفحہ ۱۵۳، ۱۵۴ بحاشیة ابراهیم۔

۱۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ ۲۔ حافظ ابن القیمؒ ۳۔ علامہ طیبیؒ

۴۔ علامہ سید جمال الدینؒ ۵۔ علامہ سندھیؒ ۶۔ امام ملا علی قاریؒ

۷۔ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ۸۔ قاضی شوکانیؒ ۹۔ شیخ الہند حضرت مولانا

محمود الحسنؒ ۱۰۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ وغیرہم من الاکابرؒ۔

پیشِ نظر رہے کہ ان حوالجات سے ان ائمہ واکابر کے اپنے اپنے مذہب بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ ارشادِ نبوت کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لیے یہ اہلِ فن کی ٹھوس بےلاگ شہادتیں ہیں، جن کے مقابلے میں کسی احتمالِ ثانی کی گنجائش نہیں۔

۱۔ آں حضرتؐ کے ارشاد پر کہ "تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے" صحابہ کرامؓ کا یہ سوال کہ "بعد الوفات یہ کیسے پیش ہوگا" اور اس پر آپ کا یہ جواب کہ وفات کے بعد پیغمبروں کے جسموں کے ساتھ عام دوسرے انسانوں جیسا معاملہ نہیں ہوتا، یعنی وہ اس طرح محفوظ رہتے ہیں کہ ان پر صلوٰۃ وسلام پیش ہوتا رہتا ہے، ان تمام امور کا تذکرہ کرتے اور سوال وجواب کے باہمی ربط کو حل کرتے ہوئے، علامہ طیبیؒ اس حدیث کا نتیجہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

ویؤیدہ ما یسرد فی الحدیث الثالث قولہ فنبی اللہ حی یرزق۔ (طیبی شرح مشکوٰۃ ص۸۲)

حدیث حفظِ اجسادِ انبیاء کے اس مطلب کی تائید میں دوسری حدیث میں صریح الفاظ بھی مل جاتے ہیں کہ اللہ کا پیغمبر زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی ملتا ہے۔

عمدۃ المحققین حضرت علامہ سندھیؒ حاشیہ نسائی میں اس حدیث حفظِ اجسادِ انبیاءؑ پر رقمطراز ہیں:۔

والجواب بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ حرم علی الارض

آں حضرتؐ کا یہ ارشاد فرمانا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ پیغمبروں کے جسموں کو

اجساد الانبیاء کنایۃ عن کون الانبیاء احیاء فی قبورھم۔

کھائے، یہ اس کا کنایہ ہے کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

(جلد ۱ ص ۱۵۵ دھلی)

۳۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ :۔

قال اکثروا علی من الصلوٰۃ یوم الجمعۃ فان صلوتکم معروضۃ علی فقالوا کیف تعرض صلوٰتنا علیک وقد ارمت ای بلیت قال ان اللہ حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء فاخبر انہ یسمع الصلوٰۃ من القریب ویبلغ ذالک من البعید۔

(رسائل ابن تیمیہ الکلام فی مناسک الحج ص ۳۹۱)

حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ پیغمبروں کے جسموں کو مٹی بنانا زمین پر حرام ہے۔ اس حدیث میں حضورؐ نے یہی بات بتلائی ہے کہ آپ قبر کے قریب پڑھے جانے والے درود کو خود سنتے ہیں اور دور کا پڑھا ہوا درود (بتوسط ملائکہ) پہنچایا جاتا ہے۔

تنبیہ

یہاں فاخبر انہ یسمع الصلوٰۃ من القریب ـــــ میں دو احتمال ہیں۔

اوّل یہ کہ یہ پہلی حدیث حفظِ اجسادِ انبیاءؑ کا مفہوم اور نتیجہ ہے، یعنی جسدِ اطہر اس طرح محفوظ ہے کہ اس پر صلوٰۃ و سلام پیش ہوتا رہتا ہے اور آپ قبرِ مبارک میں اس طرح زندہ ہیں کہ قریب کے درود کو خود سنتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہاں آپ کو حیاتِ جسدی حاصل ہے۔

ثانیاً ہو سکتا ہے کہ شیخ الاسلام کی مراد ان الفاظ سے وہ دوسری حدیث ہو جو حضرت ابو ہریرہؓ سے باختلافِ الفاظ اصبہانیؒ، ابن حبانؒ اور بیہقیؒ نے روایت کی ہے۔ اس میں من صلی علی عند قبری ...... الحدیث کے الفاظ میں قریب و بعید درود پڑھنے کے احکام صراحت سے منقول ہیں۔ اس صورت میں امام ابنِ تیمیہؒ کا دونوں حدیثوں کو فاخبرہ سے جوڑنا اس بات کا اشارہ ہے کہ حفظِ اجسادِ انبیاءؑ والی روایت اور روضۂ اطہر کے قریب درود شریف خود سُننے کی روایت کا مآل کار ایک ہیں اور مضمون دونوں کا روضۂ منورہ کی جسمانی حیات ہے۔

۴۔ شیخ الاسلام حافظ ابن قیمؒ :-

ومعلوم بالضرورة ان جسدہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الارض طری مطرًا وقد سأله الصحابة كيف تعرض صلوتنا عليك وقد ارمت فقال ان الله حرم على الارض ان تاكل اجساد الانبياء ولو لم يكن جسده فی ضریحه لما اجاب بهذا الجواب وقد صح عنه ان الله تعالی وكل بقبره الملئكة يبلغون عن امته السلام وصح عنه انه خرج بين ابی بكر وعمر وقال هكذا نبعث هذا مع القطع بان روحه الكريمة فی الرفيق الاعلیٰ فی اعلیٰ عليين مع ارواح الانبياء ..... فالروح هناك ولها اتصال بالبدن فی القبر واشراف عليه وتعلق بحيث يصلی فی قبره ويرد سلام من سلم عليه وهی فی الرفيق الاعلیٰ ـــــ کتاب الروح ص۴۵ مطبوعہ حیدر آباد۔

وبهذا التعلق رای موسیٰؑ قائمًا يصلی فی قبره ۔

(زاد المعاد ص۲۹)

ترجمہ :- یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر بالکل تر و تازہ روضۂ منورہ میں تشریف فرما ہے۔ آپ سے صحابہ رض نے پوچھا تھا کہ وفات کے بعد آپ پر صلوٰۃ و سلام کیسے پیش ہوتا رہے گا، اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ پیغمبروں کے جسموں کو کھائے۔ اگر آپ کا جسدِ اطہر قبر شریف میں[1] نہ ہوتا، تو آپ ہرگز یہ جواب ارشاد نہ فرماتے! اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے روضۂ منورہ کے[2] ساتھ فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جو آپ کو آپ کی اُمت کا سلام پہنچاتے رہتے ہیں اور یہ بھی آپ سے صحیح طور پر ثابت ہوئے کہ آپ حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض کے مابین تشریف لائے اور فرمایا کہ ہم اسی طرح اُٹھائے جائیں گے۔ ان سارے حقائق کے ساتھ یہ بات قطعی ہے کہ آپ کی رُوحِ مبارک اعلیٰ علیین میں رفیقِ اعلیٰ میں ہے، جہاں کہ دوسرے انبیاءِ کرام کی ارواحِ مقدسہ ہیں، پس رُوح تو وہاں ہے، وہیں سے اسے روضۂ منورہ میں رکھے جسدِ اطہر کے ساتھ اتصال ہو رہا ہے۔ رُوح و بدن کا ایسا قوی تعلق قائم ہو چکا ہے کہ آپ اپنی قبرِ شریف میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور ہر سلام کرنے والے کے سلام کا جواب

---

[1] یہ غالباً اس نظریے کی تردید ہے جو علامہ قونوی رح نے کہا ہے کہ انبیاءِ کرام کے اجسادِ مطہرہ دفن کے کچھ دنوں بعد اپنی قبروں میں باقی نہیں رہنے دیے جاتے، وہاں سے انھیں اعلیٰ علیین یا حظیرۂ قدسیہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ گویا انبیاءِ کرام کی حیاتِ جسمانی انھیں قبور میں نہیں ہوتی، بلکہ اعلیٰ علیین میں وہ اسی جسدِ عنصری سے زندہ ہوتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح اس اختلاف کا ماحصل یوں بیان کرتے ہیں۔ پس محصل اختلاف در دوام ما استمرار است در قبور بجائیکہ پیش از وفات بود (جذب القلوب ص۱۸۶) امام بیہقی رح نے ایک احتمال کے درجے میں اس طرف اشارہ کیا ہے وقد یحتمل ان یکون المراد به رفع اجسادهم مع ارواحهم (حیات الانبیاء امام بیہقی ص۲ مصر) حافظ ابن قیم رح اس نظریے کی احادیث کی روشنی میں تردید فرما رہے ہیں اور ثابت کر رہے ہیں کہ انبیاءِ کرام کو ان کی قبور ہی میں حیاتِ جسدی حاصل ہوتی ہے، ہاں یہ رُوح کی وسعت اور کمال ہے کہ اس کا استقرار علیین میں بھی ہو اور اتصال جسدِ اطہر کے ساتھ بھی ہو، یہاں تک کہ وہ قبور شریفہ میں نمازیں بھی پڑھتے ہوں۔

[2] اس حدیث سے واضح ہوا کہ عرضِ صلوٰۃ و سلام روضے ہی پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جسدِ عنصری وہیں ہے۔ اگر اس پر فیضانِ حیات نہ ہو تو فرشتے مقرر کرنے کا کیا فائدہ؟

میتے ہیں۔ رُوح و بدن کے اسی تعلق کی بنا پر آپ نے موسٰیؑ علیہ السلام کو اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا تھا۔" انتہی کلامہٗ۔

حافظ ابنِ قیمؒ کے کلام کا خلاصہ یہی ہے کہ انتقال بہ برزخ کے بعد رُوح کو اس قدر وُسعت حاصل ہو جاتی ہے کہ رفیقِ اعلیٰ میں استقرار کے باوجود قبورِ شریفہ کے اجسامِ مطہرہ اس کے اتصال سے زندہ ہوتے ہیں اور اپنی اپنی قبروں میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ وہاں رُوح اور حیات میں تلازم نہیں، تقومِ حیات کے لیے فقط اتنی تاثیر اور اتنا اتصال ہی کافی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم!

۵۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ عینیؒ :-

صح عنه صلى الله عليه وسلم ان الارض لا تأكل اجساد الانبياء ..... فتحصل من جملة هذا القطع بانهم غيبوا عنا بحيث لا ندركهم وان كانوا موجودين احياء وذالك كالحال في الملائكة عليهم الصلوٰة والسلام فانهم موجودون احياء لا يراهم احد من نوعنا الا من خصه الله تعالى بكرامته واذا تقرر انهم احياء ..... الخ

عینی علی البخاری جلد ۱۱ صفحہ ۶۹

آں حضرتؐ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ زمین انبیاءِ کرامؑ کے جسموں کو نہیں کھاتی، ایسے ارشادات سے یہ نتیجہ قطعی طور پر حاصل ہوتا ہے کہ انبیاءِ کرامؑ زندہ ہیں۔ صرف وہ ہم سے غائب کر لیے گئے ہیں کہ ہم ان کا اِدراک نہیں کر سکتے؛ جیسا کہ فرشتوں کا معاملہ ہے کہ وہ زندہ بھی ہیں اور موجود بھی، لیکن ہم ان کو پا نہیں سکتے۔ ہاں جن پر اللہ تعالیٰ کرامت فرما دے، وہ انھیں دیکھ بھی سکتے ہیں۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاءِ کرامؑ زندہ ہیں۔

۶ - حضرتِ امام ملا علی قاری علیہ رحمۃ ربہ الباری :-

قال ای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ حرم علی الارض ای منعها وفیه مبالغة لطیفة اجساد الانبیاء ای من ان تاکلها فان الانبیاء فی قبورهم احیاء ..... فحصل الجواب ان الانبیاء احیاء فی قبورهم فیمکن لهم سماع صلوٰة من صلی علیهم - تامل -

(مرقات جلد ۲ ص ۲۰۹)

آں حضرتؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ پیغمبروں کے جسموں کو کھائے یہ اسی لیے تھا کہ انبیائے کرامؑ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں (صحابہؓ کے اس سوال کے، کہ بعد الوفات یہ صلوٰۃ وسلام کیسے پیش ہوگا) جواب میں یہ ارشاد فرمایا، اس کا ماحصل ہی یہ ہے کہ انبیاءؑ اپنی قبورِ شریفہ میں اس طرح زندہ ہوتے ہیں کہ جو ان پر صلوٰۃ و سلام پڑھے، اسے وہ خود سُن سکتے ہیں۔

۷ - حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ :-

اس حدیث حفظِ اجسادِ انبیاءؑ کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں :-

۱ - "ازیں جا معلوم می شود کہ حیاتِ انبیاءؑ حیاتِ جسمی و دنیاوی است نہ مجردِ بقائے ارواح"۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۹۲۰ طبع قدیم)

۲ - "کنایہ است از حیات ..... وحیاتِ انبیاءؑ متفق علیہ است، ہیچ کس را در وے خلافے نیست حیاتِ جسمانی دنیاوی حقیقی ...... و دریں حدیث کہ فرمود ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء اشارت است بآں"۔

(اشعۃ اللمعات جلد ۱ ص ۶۱۳)

۳ - کنایۃ عن حیاتهم کما یاتی من حدیث ابی الدرداءؓ والمذهب ان الانبیاء احیاء حیوٰة حقیقیة (لمعات التنقیح ص ۳۳۱)

۴ - بدانکہ در حیاتِ انبیاءؑ علیہم السلام، و ثبوتِ ایں صفت مر ایشاں را و ترتّبِ

آثار و احکامِ آں ہیچ کس را از علماء خلافے نیست"۔ (جذب القلوب ص۱۸۶ لکھنؤ)

۵۔ "انبیاء علیہم السلام کو موت نہیں، وہ زندہ اور باقی ہیں، ان کے واسطے وہی ایک موت ہے، جو ایک دفعہ آچکی۔ اس کے بعد ان کی روحیں بدن میں لوٹا دی جاتی ہیں اور جو حیات ان کو دنیا میں تھی، وہی عطا فرماتے ہیں"۔

(تکمیل الایمان مترجم ص۵ مصنفہ شیخ دہلوی)

۸۔ مقتدائے فرقہ اہلِ حدیث فاضلِ جلیل قاضی شوکانی رح لکھتے ہیں:۔

والاحادیث فیها مشروعیة الاکثار من الصلوٰة علی النبی ﷺ یوم الجمعة وانها تعرض علیه وانه حی فی قبره ...... قال ان الله حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء وقد ذهب جماعة من المحققین الی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم حی بعد وفاته۔	احادیث سے ان امور کی شرعی حیثیت ثابت ہے:۔ (۱) جمعہ کے دن آپ پر درود کثرت سے پڑھا جائے۔ (۲) درود شریف آپ پر پیش ہوتا ہے۔ (۳) آپ اپنی قبرِ مبارک میں زندہ ہیں، چنانچہ حضور نے فرمایا کہ ربّ العزت نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیائے کرام کے جسموں کو مٹی بنائے اور محققین کی ایک پوری جماعت اس تحقیق پر پہنچی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات شریفہ کے بعد پھر زندہ ہیں۔
(نیل الاوطار جلد ۳ ص ۲۱۰/۲۱۱)	

۹۔ پیشوائے فرقہ اہلِ حدیث محقق عظیم آبادی رح بھی فرماتے ہیں:۔

اجساد الانبیاء (ای من ان تأکلها) فان الانبیاء فی قبورهم احیاء (عون المعبود جلد ۱ ص ۴۰۵) فان الانبیاء فی قبورهم احیاء (بذل المجهود جلد ۲ ص ۱۹۰)	اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔ اس ارشادِ نبوت کی بنا یہ ہے کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح بذل میں ہے۔

کیا یہاں بھی کسی مخالف کا منہ بند کرنے کے لیے انبیاءؑ کی حیاتِ قبریہ کا بیان ہو رہا ہے یا محدث سہارنپوری ارشادِ نبوت کا منشا واضح کرنے کے لیے حدیث کی شرح فرما رہے ہیں اور ان سے پہلے بھی اس حدیث کی شرح میں یہی کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ فتفکروا یا اولی الابصار!

حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ اور فرقہ اہلِ حدیث نے اس ارشادِ نبوت کا مطلب کیا سمجھا اور کس وضاحت سے اس کا مدلول روضۂ اطہر کی حیاتِ عنصری قرار دیا، یہ سب آپ کے سامنے ہے۔ اب آیئے حنفیہ کرام کے طبقہ دیوبند سے بھی استفادہ کیجیے:۔

۱۰۔ صدر المحققین رئیس المحدثین شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ حاشیہ ابی داؤد میں تصریح فرماتے ہیں:۔

ان الصحابۃ سألوا بیان کیفیۃ العرض بعد اعتقادھم بانہ کائن لا محالۃ لقول الصادق دفعاً لاشتباہ ان العرض ھل ھو علی الروح المجرد او علی المتصل بالجسد حسبوا ان جسد النبیؐ کجسد کل احد فکفی فی الجواب ما قالہ علی وجہ الصواب۔

(حاشیہ ابی داؤد ص۱۵۷)

صحابہ کرامؓ کا یہ اعتقاد تو یقینی تھا کہ درود دائمی پیش کیا جاتا رہے گا، کیونکہ آپؐ یہ ارشاد فرما چکے تھے۔ پس ان کا سوال صرف پیش ہونے کی کیفیت سے متعلق تھا کہ وفاتِ شریفہ کے بعد یہ درود صرف روحِ مجرد پر یا روحِ متصل بہ جسد پر اس کا عرض ہو گا۔ حضورِ اکرمؐ کا جواب کہ انبیائے کرامؑ کے اجسادِ مطہرہ مٹی نہیں ہوتے، اس سوالِ کیفیت کا کافی جواب تھا (خلاصہ یہ کہ جسدِ اطہر اس طرح محفوظ ہے کہ اس پر صلوٰۃ و سلام برابر پیش ہوتا رہتا ہے اور روحِ مبارک کا اس جسد سے اتصال ہے)۔

تلک عشرۃ کاملۃ!

المبحث الرّابع

حدیث ابی الدرداءؓ واحوال رواتہ

"حدّثنا عمرو بن سعد[۱] المصری ثنا عبد اللہ بن وھب[۲] عن عمرو بن الحارث[۳] عن سعید بن ابی[۴] ھلال عن زید[۵] بن ایمن عن عبادۃ بن نسئی عن ابی الدرداءؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثروا الصلوٰۃ علیّ یوم الجمعۃ فانہ مشھود تشھدہ الملٰئکۃ وان احدًا لن یصلی علیّ الا عرضت علیّ صلوٰتہ حتی یفرغ منھا قال قلت وبعد الموت قال وبعد الموت ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی اللہ حی یرزق ــــ" ابن ماجہ ص۱۱۹

ترجمہ :ــ "عبادہ بن نسئی حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو، کیونکہ اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور کوئی مجھ پر درود نہیں پڑھتا، مگر یہ کہ اس کے فارغ ہوتے ہی وہ مجھ پر پیش کر دیا

---

۱ عمرو بن سعد المصری ابو محمد المصری ثقۃ من الحادیۃ عشرۃ ــــ ثقہ راوی حدیث ہیں (تقریب ص۳۹۲)۔ ۲ عبد اللہ بن وھب بن مسلم مولاھم ابو محمد المصری الفقیہ ثقۃ حافظ عابد من التاسعۃ (تقریب ص۲۹۵)۔ ۳ ثقۃ فقیہ حافظ من السابعۃ (تقریب ص۳۸۹)۔ ۴ اللیثی مولاھم ابو العلاء المصری قیل مدنی الاصل قال ابن یونس بل نشاء بھا صدوق۔ (تقریب ص۱۹۶)۔ صدوق راوی حدیث ہیں۔ ابن حزم سے پہلے کسی نے ان پر جرح نہیں کی اور ابن حزم کی جرح کا منشاء اُن کا اپنا عقیدہ تھا۔ وہ عذابِ قبر کے قائل نہ تھے اور اجسادِ قبریہ کی کسی قسم کی حیات کا انہیں اقرار نہ تھا۔ ابو داؤدؒ کی روایت جس میں قبر میں عودِ روح کا بیان ہے، اس کی سند میں ایک راوی منہال بن عمرو ہے، ان پر بھی ابن حزم نے جرح کر دی تھی۔ تنقیح الرواۃ ص۳۱ میں ہے ولما رای ابن حزم حدیث المنھال مخالفاً لمعتقدہ فی انکار عذاب الاجساد فی قبورھا طعن فیہ وطعنہ مردود والحدیث صحیح۔ (جلد ۱ ص۱۳۴) ۵ زید بن ایمن روی عن عبادۃ بن نسی وعنہ سعید بن ابی ھلال ذکرہ ابن حبان فی الثقات روی لہ ابن ماجہ حدیثاً واحداً فی فضل الصلوٰۃ علی النبیؐ قلت رجالہ ثقات (تہذیب جلد ۳ ص۳۹۸)

جاتا ہے۔ ابوالدرداؓ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ کیا وفات کے بعد بھی آپ پر درود پیش ہوتا رہے گا؟ آپ نے فرمایا کہ وفات کے بعد بھی اسی طرح پیش ہوتا رہے گا، اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ انبیاءؑ کے جسموں کو کھائے۔ پس اللہ کا پیغمبر زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی دیا جاتا ہے"۔

عبادہ بن نسیؒ:۔

مشہور تابعی ہیں۔ وفات ۱۱۸ھ میں ہوئی۔ حضرت اوسؓ، عبادہ بن صامتؓ، ابوالدرداؓ اور دوسرے کئی صحابہؓ سے احادیث سُنیں۔ زید بن ابیؒ اور سعید بن ابی ہلالؒ وغیرہما نے ان سے روایات لیں۔ امام احمدؒ، یحیی بن معینؒ، امام نسائیؒ اور ابن سعدؒ انھیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں :۔

ثلثة نفر ينزل بهم الغيث وينصر بهم على الاعداء عبادة بن نسیؒ رجاء بن حيوة وعدى بن عدى۔	تین ایسی عظیم شخصیتیں ہیں کہ ان کے وسیلے سے بارشیں برستی ہیں اور ان کی برکتوں سے دشمنوں پر فتح حاصل ہوتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلے عبادہ بن نسیؒ ہیں (توسل بالذوات)۔

(تهذيب جلد ۵ ص۱۱۴)

"تہذیب الکمال" میں بھی حضرت ابوالدرداؓ سے اُن کی حفظِ اجسادِ انبیاءؑ والی روایت منقول ہے۔ اس کے آخر میں بھی فنبی اللہ حی یرزق کے الفاظ موجود ہیں (حاشیہ تہذیب لابی الحسن جلد ۳ ص۲۹۸)۔

عبادہ بن نسیؒ سے اگلے راوی حضرت ابوالدرداؓ ہیں۔ اُن کا ترجمہ نقل کرنے اور اُن کی تعدیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ وہ تو ایک نہایت جلیل القدر صحابیِ رسولؐ ہیں۔ عبادہ بن نسیؒ سے نچلے سب راوی ثقہ ہیں اور ان کے تراجم حاشیہ میں پیش

ہو چکے ہیں اور اس پوری سند پر ماہرینِ حدیث کی ایک پوری جماعت "اسنادہ جید" کا حکم لگا چکی ہے۔ کما تقدم قبیل المبحث الاوّل قال الحافظ المنذری اسنادہ جید (ترجمان السنۃ جلد ۳ ص ۲۹۷)

عراقی شرحِ ترمذیؒ میں لکھتے ہیں کہ زید بن ایمن اور عبادہ بن نسیؒ کے مابین انقطاع ہے۔ جواباً عرض ہے کہ اصل انقطاع اس حدیث کی طبرانیؒ کی سند میں ہے جو سعید بن ابی ہلال عن ابی الدرداءؓ کے طور پر منقول ہے، وہاں رجال بھی محلِ کلام ہیں، چنانچہ حافظ ابنِ قیمؒ نے "جلاء الافہام" میں تصریح کی ہے۔

زید بن ایمن اور عبادہ کے مابین دعویٔ انقطاع پر وجہِ وجیہ مطلوب ہے۔ محض نقلِ دعوے ہی کافی نہیں۔ پھر بتایا جائے کہ یہ کون سی قسم کا انقطاع ہے، مُضر ہے یا غیر مُضر پھر بصورتِ مضرت کن کن محدثین نے اس روایت کو ردّ کیا ہے۔

بابِ ھٰھ

اگر یہ روایت مُرسل ہے، تو پیشِ نظر رہے کہ ہم اس سے بالاستقلال استدلال نہیں کر رہے، بلکہ اسے حضرت اوس بن اوسؓ کی مذکورہ سابقہ روایت کی تفسیر میں پیش کیا جا رہا ہے اور یہاں اس کا قبول کسی کے ہاں محلِ اعتراض نہیں۔ جن محدثین کو احتجاج بالمرسل میں کلام ہے، وہ بھی تفسیر المتصل بالمرسل میں مرسل کا اعتبار کرتے ہیں۔ ترمذیؒ کی متصل روایت (بالفاظ تقریب) خیر نسائھا مریم وخیر نسائھا فاطمہ کی تفسیر مسندِ حارث بن ابی اسامہ کی روایت مریم خیر نساء عالمھا و فاطمہ خیر نساء عالمھا کے ساتھ اسی اصول پر کی گئی ہے، حالانکہ ثانی الذکر بریح سند کے باوجود مُرسل ہے اور سند میں انقطاع ہے، مگر چونکہ تفسیر و توضیح میں پیش کی جا رہی ہے، اس لیے محدثین شافعیہ بھی جو احتجاج بالمرسل کے قائل نہیں اسے قبول کر رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ تفسیر المتصل بالمرسل کے باب میں بھی اس ابنِ ماجہ کی جید الاسناد حدیث کا اعتبار نہ کیا

جائے ——— وکل من تأمل فیہ علم وتیقن ان العلم بالارسال من اللہ قیق الذی لایستدرکہ الا الموفق او الطالب المتحقق۔

المبحث الخامس

کشف الحجاب عن وجہ الاضطراب

حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت:—

ان احداً لن یصلی علی الا عرضت علی صلوٰتہ حتی یفرغ منہا۔

کہ کوئی مجھ پر درود نہیں پڑھتا، مگر یہ اس کے فارغ ہوتے ہی مجھ پر پیش کر دیا جاتا ہے۔"

اس میں جو پہلے یوم جمعہ کی فضیلت اور صلوٰۃ وسلام پیش ہونے کا بیان ہے، اُس میں فضیلت کے اوقات میں درود جیسے اعمالِ صالحہ کی ترغیب ہے، صلوٰۃ وسلام پیش ہونے کے لیے جمعہ کی تخصیص نہیں، اوقاتِ فاضلہ میں اعمالِ صالحہ کا درجہ[1] اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ حضرت اوس بن اوسؓ کی روایت کا مفاد بھی یہی ہے۔ حصنِ حصین کے الفاظ "لیس یصلی علی احد یوم الجمعۃ الا عرضت علی" ——— میں بھی جمعہ کے دن پیش ہونے کی تخصیص نہیں۔ جمعہ کے دن درود پڑھنے پر اس کے پیش ہونے کی محض بشارت ہے اور یہ جو یومِ جمعہ کی فضیلت میں فرمایا:—

فانہ مشہود تشہدہ الملئکۃ۔ "اُس دن فرشتے حاضر رہتے ہیں"۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمعہ کے ماسوا باقی دنوں میں فرشتے بالکل حاضر نہیں ہوتے، بلکہ یہاں مراد کثرتِ شہود ہے، نہ یہ مطلب ہے کہ روضۂ منورہ پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے والے فرشتے ہی اُس دن حاضر ہوتے ہیں، اس مقصد کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے سیاح

---

[1] ان العمل الصالح یزید فضلاً بواسطۃ فضل الوقت وعلیٰ ھذا لاحاجۃ الی تقیید العرض بیوم الجمعۃ قالہ السندھی۔

فرشتوں کی ایک مستقل جماعت مقرر کر رکھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

ان للہ ملٰئکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام۔ (نسائی ۱ ص ۱۴۳، دارمی ص ۳۷۲)	بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے سیاحت ارض پر مقرر ہیں، جو میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے رہتے ہیں۔[۱]

یہاں بھی یوم جمعہ کی کوئی تخصیص نہیں۔ اگر اوقاتِ فضیلت میں اعمالِ فضیلت کی ترغیب دلائی جائے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اعمال یا ان کی شان ان اوقات ہی میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان اوقاتِ فضیلت میں عرضِ صلوٰۃ و سلام بھی بعض خصوصیات کا حامل ہو۔

پیشِ نظر رہے کہ ان روایات میں عرضِ صلوٰۃ و سلام کے لیے اگر جمعہ کی تخصیص نہیں، تو ہر روز کی بھی تصریح نہیں۔ یہاں عرضِ صلوٰۃ و سلام کا محض اجمالی بیان ہے۔ جن روایات سے درود پڑھتے ہی اس کا پیش ہونا متبادر ہوتا ہے، سے بھی ہم ہر روز پیش ہونے کے لیے تصریح نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ وہ بھی تو فضیلتِ جمعہ کے ضمن ہی میں وارد ہوئی ہیں۔

ہاں بعض روایات میں عرضِ صلوٰۃ و سلام کے لیے یوم جمعہ کی تصریح بھی موجود ہے، لیکن ان کی سندیں ضرور محلِ کلام ہیں۔ سُنن سعید بن منصور میں یہ مرسل روایت منقول ہے:۔

۱؎ علامہ عزیزیؒ لکھتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے (السراج المنیر ۱ ص ۴۱۹)۔ اس کی سند میں زاذان راوی حدیث ہے۔ امام ابن معین انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ابن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ خطیب اور عجلی نے بھی ثقہ کہا ہے۔ ابن عدی اور حاکم نے بھی توثیق کی ہے۔ (تہذیب جلد ۳ ص ۳۰۳)۔
حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں:۔
وزاذان من الثقات روی عن اکابر الصحابۃ کعمر وغیرہ وروی لہ مسلم فی صحیحہ قال یحیی بن معین ثقۃ وقال حمید بن ہلال وقد سئل عنہ ہو ثقۃ لا تسأل عن مثل ہولاء (کتاب الروح ص ۵۹)۔

ان صلوٰۃ امتی تعرض علیّ فی کل یوم جمعۃ ۔ (منتقی الاخبار جلد ۲ صفحہ ۳۱ مصر)۔

ان روایات کی روشنی میں اگر پہلی سب روایات کے اجمال کو اٹھائیں، تو غایت مافی الباب یہ ہوگا کہ ہر جمعہ اُمّت کے صلوٰۃ وسلام فرشتوں کے توسط سے روضۂ اطہر پر پیش ہوتے ہیں ۔

اب اس کے مقابلہ میں ان روایات کو لیجیے، جن میں یوم الجمعہ کی نہ تخصیص ہے نہ ذکر، بلکہ عمومی طور پر صلوٰۃ وسلام پیش ہوتے رہنے کا بیان ہے ۔ ابوداؤد میں ہے:

ما من احد یسلم علیّ الا ردّ اللہ علیّ روحی فارد علیہ السلام ۔ (جلد ۱ ص ۲۷۹)[1]

جب بھی کوئی مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری رُوح کو میری طرف متوجہ فرما دیتے ہیں ۔ پس میں اس کا جواب دیتا ہوں ۔

اس میں صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہی اس کے پیش ہوتے رہنے کا بیان ہے، نہ جمعہ

---

[1] رواتہ ثقات (فتح الباری پ ۱۳ ص ۲۷۹) رواتہ ثقات (عقیدۃ الاسلام للامام السید انور شاہ ص ۳۰۲، فتح الملہم جلد ا ص ۳۲۳) اسنادہ ھکذا حدثنا محمد بن عوف ثنا المقری ثنا حیوۃ عن ابی صخر حمید بن زیاد عن یزید بن عبد اللہ بن قسیط عن ا[بی ہریرۃ] و اخر کتاب المناسک و تقدیم الکلام ما من احد یسلم علیّ الا ارد علیہ السلام لا فی حی قدرہ علیہ (کذا فی الشرح جلد ۲ ص ۱۶۹) قال المحدث السخاوی یوخذ من ھذہ الاحادیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی علی الدوام و ذالک انہ محال عادۃ ان یخلو الوجود کلہا من واحد یسلم علیہ فی لیل و نہار ونحن نومن ونصدق بانہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق فی قبرہ وان جسدہ الشریف لا تاکلہ الارض والاجماع علی ھذا اھ (القول البدیع ص ۱۲۵) ردّ اللہ علیہ روحہ لاجل سلام من یسلم علیہ واستمرت فی جسدہ صلی اللہ علیہ وسلم لا انہا تعاد ثم تنزع ثم تعاد (القول البدیع ص ۱۳۴) قال المحدث انور شاہ الظاہر منہ انہ لم یوجد ھناک نقل من موطن الی موطن وانما ھو نقل من حالۃ الی حالۃ وتبدیلہا ولعل المراد بحدیث الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون انہم بقوا علی ھذہ الحالۃ ولم تسلب عنہم (عقیدۃ الاسلام ص ۳۶) ۔ اس صورت میں معنی حدیث شریف یہ ہوں گے کہ جب کوئی سلام بھیجتا ہے، تو خداوند کریم آپ کی رُوح پُرفتوح کو اس حالتِ استغراق کی قاعات اللہ و تجلیات اللہ سے ... متوجہ فرما دیتا ہے ... جو کسی امتی آپ پر سلام عرض کرے گا، اس کی طرف کا شعبہ کھلے گا ارتداد جملہ شعب لازم نہیں اور ظاہر ہے ۔ اس شعبہ کا انعدام بحیثیت اطلاعِ سلام معلوم تو ہوگا پر موجب زوال استغراق مطلق نہ ہوگا (مکتوبات شیخ الاسلام مولانا مدنی رح جلد ۱ ص ۲۳۴) والمعنی ان اللہ سبحانہ یرد روحہ الشریف عن استغراقہ المنیف لیرد علی مسلمہ (شرح الشفا للملا علی القاری جلد ۲ ص ۱۴۲ مصر) والتفصیل فی نسیم الریاض للخفاجی جلد ۳ ص ۴۹۹) ۔

کی کوئی تخصیص، نہ اس کا کوئی پہلے ذکر ہے۔ "غنیۃ الطالبین" کی روایت سے "کل یوم" کے الفاظ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ یہ مفہوم یقیناً ان روایات سے متعارض ہے، جن میں عرضِ صلوٰۃ وسلام کے لیے یوم جمعہ کی تخصیص تصریحاً یا تفسیراً تسلیم کر لی گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان دو متعارض مضامین میں کوئی صورتِ مطابقت ہے۔ ایک طرف کی روایات میں ہر جمعہ کے دن عرضِ صلوٰۃ وسلام متبادر ہوتا ہے اور توسطِ ملائکہ کا تذکرہ ملتا ہے اور دوسری طرف کی روایات ہر روز بلکہ ہر آن عرض صلوٰۃ و سلام کا پتہ دے رہی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان روایات کو متصادم قرار دے کر کیا "اضطراب فی الروایۃ" کا دعوے کر دیا جائے گا یا اس تعارض کو اٹھانے کی کوشش کی جائے گی؟ کیا کسی محدث یا شارحِ حدیث نے محض اسی بنا پر اس روایت کو مضطرب قرار دیا ہے؟ من ادعی فعلیہ ان یأتی بالنقل۔

لیجیے مزید بحث کی ضرورت نہیں، خود ارشادِ نبوّت ہی اس اضطراب کو رفع کر دیتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی نائیا بلغتہ۔

(رواہ ابو الشیخ بسند جید کما فی الفتح جلد ۱ ص۳۳۰)

(ترجمہ) "جو میرے روضہ پر آکر مجھ پر درود پڑھے اُسے میں خود سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھے، وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔"

بات صاف ہو گئی کہ درود پڑھنے اور پہنچنے کی دو صورتیں ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں قسم کی روایات کو ان پر منطبق کر لو۔ روضۂ منوّرہ کے پاس حاضر ہو کر درود پڑھنا ہر وقت پہنچتا ہے اور دور سے پڑھا جمعہ کے دن فرشتوں کے توسّط سے پہنچایا جاتا ہے۔ جب اس تقسیم پر غور کیا تو امام احمد کی روایت میں ما من احد یسلم علی کے مضمون کی اور وضاحت ہو گئی۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

ما من احد یسلم علیٰ قبری الا رد اللہ علی روحی۔

دیکھیے رفعِ تعارض اور تطبیق بین القولین کے لیے "عرضِ سلام بوقت تسلیم" کا جو مطلب ہم نے بتایا تھا کہ یہ قربِ روضہ کے لیے ہے' وہی مضمون "علی قبری" کی عبارت میں خود الفاظِ نبوت ہو کر سامنے آگیا ہے۔

وکم من عائب قولاً صحیحًا
وآفتہ من الفھم السقیم

سیدنا مُلّا علی قاریؒ فرماتے ہیں:۔

"درود و سلام پہنچانے کے لیے فرشتوں کا تقرر اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو روضۂ اطہر سے دور ہو"۔ (مرقات ص ۶/۲)

"نیز از ابنِ عمر آمدہ من صلی علی عند قبری زدت علیہ ومن صلی علی فی مکان آخر بلغونیہ"۔ (جذب القلوب ص ۱۸۲)

باقی رہا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں فانکم لا تدرون لعل ذٰلک یعرض علیہ (ابن ماجہ ص ۶۵) کے الفاظ' سو اس لفظ "لعل" میں درود پہنچنے کی کسی تغیری صورت کا ذکر نہیں' بلکہ اس کی قبولیت اور عدمِ قبولیت کے احتمالات کا بیان[1] ہے' یعنی درود شریف اچھی طرح اور پوری توجہ ہی سے پڑھا جائے تبھی حضورؐ کی خدمت میں پہنچتا ہے۔

بعض واعظین کا یہ کہنا کہ براہِ راست سننے اور بتوسط ملٰئکہ پہنچنے کا فرق قرب و بُعد کے لیے نہیں' بلکہ محبت اور عدمِ محبت کے لیے ہے' جو شخص محبت سے درود پڑھے' وہ خود سنتے ہیں اور دوسرا فرشتوں کی وساطت سے پہنچایا جاتا ہے' یہ سب وسوسے اور توہمات ہیں۔ تحقیق میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ درود شریف تو پڑھا ہی

---

[1] ان الترجی فی قبولیۃ الصلوٰۃ فان عرضہ لا یکون الا بشرط القبول لعدم اختلاطہ بالریاء (انجاح الحاجہ)۔

محبت سے جاتا ہے، خواہ روضے کے پاس حاضر ہو، خواہ دور سے پڑھ رہا ہو۔ وہ کون سا بدبخت ہوگا جو محبت کے بغیر درود پڑھتا ہو۔ کامل ترین محبت کے بغیر تو ایمان ہی مکمل نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے حضورؐ پر وہی درود پیش ہوتا ہے جو پوری توجہ اور محبت سے پڑھا جائے، روضہ پر حاضری ہو تو خود سماعت فرماتے ہیں، دور سے پڑھا جائے، تو فرشتوں کے توسط سے پہنچتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ عرضِ صلوٰۃ وسلام کی روایات میں کوئی تعارض نہیں۔ اگر پہلی روایات کی بعض مرسل اور کمزور روایات کی روشنی میں یوم جمعہ کے ساتھ تخصیص نہ کریں، تو پھر تو تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرب وبعد کا صلوٰۃ وسلام ہر روز بلکہ ہر ساعت پہنچتا ہے اور اگر ان روایات کے اجمال کی بعض کمزور اور مرسل قسم کی روایات کے ساتھ تفصیل کر دی جائے اور تبلیغ صلوٰۃ وسلام کو یوم جمعہ سے خاص سمجھا جائے، تو پھر اس کی تطبیق دوسری روایات سے یوں ہوگی کہ قریب کے صلوٰۃ وسلام کے لیے تو کسی وقت کی تخصیص نہیں اور دور کا مجموعی طور پر جمعہ کے دن پیش ہوتا ہے۔ پس جملہ اختلاف اور اضطرابات رفع ہو گئے۔ الحمد للہ علی ذالک والمختار عندی ھو الاول واللہ اعلم بالصواب۔

(نوٹ) طبرانیؒ کی ایک روایت میں "لیس من عبد یصلی علیّ الا بلغنی صلوٰتہ" کے الفاظ ہیں۔ (نیل الاوطار جلد ۳ ص ۲۱۱) حافظ ابن قیمؒ کی جلاء الافہام میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے، لیکن تصحیف کاتب سے بلغنی صلوٰتہ کے بجائے بلغنی صوتہ لکھا گیا ہے۔ ناظرین طبرانیؒ کے حوالے سے جلاء الافہام کے حوالے میں تصحیح کر لیں۔ طبرانیؒ کی اس روایت میں سعید بن ابی ہلال اور حضرت ابوالدرداءؓ کے مابین انقطاع ہے۔

المبحث السادس

التحقیق المفید فی الذب عن الشیخ الشہیدؒ

بعض مبتدعین حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل الشہیدؒ کے ذمّہ یہ لگاتے ہیں کہ وہ انبیاء کرامؑ کے (وفات شریفہ کے بعد) مٹی کے ساتھ مٹی ہو جانے کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک، یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کے اجسادِ مطہرہ مٹی پر حرام فرما دیئے ثابت نہیں اور اگر ثابت تھی، تو پھر ان کی تحقیق میں ضعیف ہوگی۔ اس الزام کے لیے حضرت شہیدؒ کی جو عبارت پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے :۔

"یعنی میں بھی ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں، تو کب سجدے کے لائق ہوں۔" (تقویۃ الایمان)

یہاں لفظ "ملنا" محلِ اعتراض ہے اور اسی پر الزام کی ساری عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ حالانکہ مٹی کے ساتھ ملنا اور بات ہے اور مٹی ہونا اور بات ہے۔

اردو زبان میں لفظ "ملنا" کے معنی یہ ملتے ہیں :۔

پیوستہ ہونا۔ ملحق ہونا۔ چسپاں ہونا۔ ایک ذات ہونا۔ (نور اللغات جلد ۴ ص ۳۴۲)

معترضین خواہ مخواہ اس لفظ کو چوتھا معنی پہناتے ہیں، تاکہ پھر کفر کی مشین کو حرکت دے سکیں۔ حق یہ ہے کہ حضرت شیخ شہیدؒ کی عبارت میں یہ پہلے معنی مراد ہیں۔ اس تشریح میں حضورؐ کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ مجھے بھی ایک دن پردہ قبر میں جانا ہے۔ مٹی میں ملنے والا ہوں۔ اس سے یہی مراد ہے کہ ایک دن مجھے قبر کی مٹی سے ملحق ہونا ہے، نہ یہ کہ مجھے مٹی ہی ہو جانا ہے۔ (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، استغفر اللہ!)

اردو زبان کا جامع ترین لغت "جامع اللغات" جلد ۲ ص ۵۶۵ میں خاک

میں ملنا" کے معنی دفن ہونا اور مٹی میں پڑنا بھی لکھے ہیں۔ جلد ۴ صفحہ ۱۴۶ میں لکھا ہے مٹی سے مٹی مل جانا" دفن ہونا"

"منیر اللغات" صفحہ ۹۰ میں ہے :۔ خاک میں ملنا" دفن ہونا"۔

اسی طرح "سعید اللغات" مرتبہ منیر لکھنوی میں ہے مٹی میں مل جانا" دفن ہو جانا"۔

ان تصریحات کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ مٹی میں ملنے والا ہوں کا معنی بھی ہے کہ ایک دن مجھے قبر میں دفن ہونا ہے۔ اب اسے ضد و عناد سے ان معنوں پر محمول کرنا، جو مصنف کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ گزرے ہوں، کس قدر فریب اور ظلم ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ!

پیشِ نظر رہے کہ جب کوئی چیز دوسری چیز کے ساتھ کسی ایک جہت سے چسپاں ہو، تو اس ملنے کو اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ "یہ چیز اس چیز سے ملی ہوئی ہے"۔ لیکن اگر اول الذکر کو اس ثانی الذکر چیز نے چاروں طرف سے احاطہ کر رکھا ہو اور اس کی ہر جہت اس سے ملحق ہو رہی ہو، تو پھر پہلی چیز کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ "یہ چیز اس چیز سے ملی ہوئی ہے"، بلکہ زیادہ بلیغ انداز یہی ہو گا کہ "سے" کے بجائے "میں" کا لفظ اختیار کیا جائے۔ حضورِ اکرمؐ کے جسدِ اطہر پر روضۂ منورہ ہر جہت سے چسپاں ہو رہا ہے، اس لیے حضورؐ کی طرف سے یہ مضمون ان لفظوں میں ادا کیا گیا :-

"مٹی میں ملنے والا ہوں، تو کب سجدے کے لائق ہوں!" (تقویۃ الایمان)

ویسے "نور اللغات" جلد ۴ صفحہ ۴۳۸ پر لکھا ہے کہ "میں" کبھی "سے" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے کہتے ہیں درخت میں باندھ دو یعنی درخت سے باندھ دو۔ چند عیّن محض بغض و عناد اور اپنی کور باطنی کی وجہ سے اس عبارت کے معنے لگاتے ہیں اور اس مضمون کو حدیثِ حفظِ اجسادِ انبیاءؑ سے خواہ مخواہ ٹکراتے ہیں، حالانکہ حضرت

شیخ شہیدؒ اور ان کے حلقۂ اعتقاد میں اس عبارت کا مفہوم ہمیشہ یہی سمجھا گیا ہے کہ حضورِ اکرمؐ ایک دن ضرور پردۂ قبر میں تشریف لے جائیں گے اور اس کے لیے آپ کو اس دروازے سے بھی گزرنا ہوگا، جس کے بغیر کوئی اس عالم سے اس عالم میں منتقل نہیں ہو سکتا اور اسی دروازے کو موت کہتے ہیں، جس کی لذت آشنائی انبیاؑ کے لیے بھی ضروری ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ لکھتے ہیں :-

"مٹی میں ملنے کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ مٹی ہو کر زمین کے ساتھ خلط ہو جائے جیسا سب اشیا زمین پر پڑ کر خاک ہو کر زمین ہی بن جاتی ہیں، دوسرے مٹی سے متصل ہونا یہاں (یعنی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے کلام میں) مراد دوسرے معنی ہیں اور جسدِ انبیاء علیہم السلام کے خاک نہ ہونے کے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ بھی قائل ہیں۔" (فتاویٰ رشیدیہ ص۹)

محدثینِ حنفیہ اور شافعیہ نے بھی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے (جس کی تشریح کے ضمن میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے عبارت زیرِ بحث لکھی تھی) آں حضرتؐ کی طرف سے ایک ایسے ہی مضمون کو ادا کیا ہے۔

اُسجدوا للحی الذی لا یموت ولمن ملکہ لا یزول فانک انما تسجد لی الآن مهابةً واجلالاً فاذا صرتُ رهینَ رمسٍ امتنعتَ عنه۔

(مرقات جلد ا ص۲۴۹)

سجدے تم اسی ذات کو کرو جو زندہ ہے اور اس پر فنا کبھی نہ آئے گی اور جس کی بادشاہی لازوال ہے۔ بے شک تو اس وقت میری ہیبت اور میری تعظیم کے لیے سجدہ کرنے کو تیار ہو رہا ہے، لیکن جب میں مٹی کے قبضے میں چلا جاؤں گا تو اس وقت تو سجدے سے رک جائے گا۔

علامہ طیبیؒ شافعیہ میں اور ملا علی قاریؒ حنفیہ میں بہت بلند پایہ ائمۂ فقہ و حدیث

ہیں، اُنھوں نے ارشادِ نبوّت کے اس مضمون کو آں حضرتؐ کی طرف سے اسی طرح ادا فرمایا ہے، جس طرح کہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے اس مضمونِ حدیث کو بیان کیا ہے' ہاں ان بزرگوں کے الفاظ :-

فاذا صرت رھین رامس —— جب میں قبر کی مٹی میں گرفتار ہو جاؤں۔

مولانا شہیدؒ کے مقابلے میں ذرا زیادہ سخت ہیں۔ ہمیں عوامی سطح پر ایسے الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

بعض معترضین مٹی کی پوری بحث ہی کو ہدفِ طعن بنا لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر ہی خاکی نہ تھا۔ نہ مٹی سے بنا اور نہ مٹی میں رہنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ مولوی احمد رضا خاں صاحبؒ حضورِ انورؐ کی حدیث نقل فرما رہے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا :-

انا وابوبکر وعمر خلقنا من تربۃ واحدۃ فیھا ندفن	میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ ایک ہی مٹی سے بنے ہیں اور اسی میں دفن ہوں گے۔

(فتاوٰی افریقہ ۸۵)

معلوم ہوا کہ جسدِ اطہر خاکی ہی تھا اور ذاتِ اقدس کو مٹی سے گریز نہ تھا۔ ہاں آپؐ اپنی صفات میں منبعِ نور و عرفان اور مرکزِ ہدایت و ایمان تھے اور اس سے کس بدبخت کو انکار ہو سکتا ہے!

الفصلُ الثّانی

وفیہ ستّۃ من المباحث

حدثنا ھدّاب[۱] بن خالد و شیبان[۱] بن فروخ قالا اخبرنا حماد[۲] بن سلمۃ عن ثابت[۳] البنانی و سلیمان[۴] التیمی عن انس[رض] بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتیت وفی روایۃ ھداب مررت علی موسٰی لیلۃ اسری بی عند الکثیب الاحمر وھو قائم یصلی فی قبرہ — (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۶۸، نسائی جلد ۱ ص ۱۸۵)

(ترجمہ) حضرتِ انس[رض] کہتے ہیں کہ حضور[ؐ] نے فرمایا معراج کی رات میں سُرخ ٹیلے کے قریب مُوسٰی علیہ السّلام کے پاس سے گزرا، کیا دیکھتا ہوں کہ وُہ اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہیں۔

اِس صحیح حدیث میں حضرت مُوسٰی علیہ السّلام کا اپنی قبرِ شریف میں زندہ ہونا اور نمازیں پڑھنا بصراحت مذکور ہے۔ قرآنِ عزیز فرماتا ہے :-

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ فَلَا تَکُنْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَآئِہٖ ۔	اور ہم نے مُوسٰی[ع] کو کتاب دی۔ پس ان کی مُلاقات میں کسی قسم کا شک نہ کریں۔

(پ ۲۱ سجدہ ع)

یعنی آپ جو شبِ معراج میں مُوسٰی علیہ السلام کو ملے تھے، وُہ امرِ واقع اور سچی حقیقت تھی، یہ کوئی خواب یا کسی مِثالی وُجود اور رُوح کی ملاقات نہ تھی اور نہ ہی کوئی دھوکہ یا نظر بندی تھی۔ آپ یقیناً اسی شخصیت کو ملے تھے، جسے کہ ہم نے تورات

دی تھی ۔ ظاہر ہے کہ یہ تورات دینا کسی مثالی وجود کو نہ تھا اور نہ ہی وہاں روح متمثل ہو رہی تھی، بلکہ تورات لینے والے خود موسیٰ علیہ السلام تھے، جن کا جسم عنصری تھا انہی کو آں حضرتؐ نے شبِ معراج میں دیکھا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ آپ اس موسیٰؑ کی ملاقات میں ہرگز شک نہ کریں۔

المبحث الاوّل

یہ سوال پیدا کیا جاتا ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السّلام اپنی قبر منوّر میں زندہ موجود تھے، تو پھر بیت المقدس میں ان کا حاضر ہونا اور باقی انبیاءؑ کے ساتھ حضورؐ کی اقتدا میں نماز پڑھنا اور پھر آسمانوں پر حضورؐ کو ملنا اور پھر آپ کی واپسی پر نمازوں کی تخفیف کے لیے آپ سے مذاکرہ کرنا، آخر ان تمام ملاقاتوں کا محل کیا ہو گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ قبر میں بھی زندہ موجود ہوں، بیت المقدس میں بھی حاضر ہوں اور ملاء اعلیٰ میں بھی تشریف فرما ہوں!

افسوس ہے کہ یہاں وہ امور زیرِ بحث لائے جا رہے ہیں، جن کی مدارسِ عربیہ کے متوسط طالب علموں سے بھی توقع نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ تعارض کے لیے وحدتِ زمان شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحؒ لکھتے ہیں:۔

وصلوتهم فی اوقات مختلفة وفی اماکن مختلفة لا یرده العقل وقد ثبت به النّقل فدلّ ذٰلك علی حیاتهم۔

(فتح الباری کتاب الانبیاء پ ۱۳ ص ۳۷۸ دهلی)

(ترجمہ) اور انبیائے کرام کا مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر نمازیں پڑھنا یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ عقلِ سلیم اس سے متصادم نہیں۔ اور نقلِ صحیح اسے ثابت کر رہی ہے پس یہ ان کے زندہ ہونے پر کافی شہادت ہے۔"

یعنی قبر میں نماز پڑھنا، پھر بیت المقدس میں نماز پڑھنا، اور پھر ملاءِ اعلیٰ میں ملنا، اِن سب کے اوقات مختلف ہیں۔ پس تعارض لازم نہیں آتا ـــــــ فتفکّروا یا اولی الابصار!

محدثِ کبیر امام بیہقیؒ فرماتے ہیں :۔

فی قصة المعراج انه لقیهم فی جماعة الانبیاء فی السمٰوٰت وکلمهم وکلموه وکل ذالك صحیح لا یخالف بعضه بعضاً فقد یری موسیٰ علیه السلام قائماً یصلی فی قبره ثم یسری بموسیٰؑ وغیره الیٰ بیت المقدس کما اسری بنبینا صلی الله علیه وسلم فیراهم فیه ثم یعرج بهم الی السمٰوٰت کما عرج بنبینا صلی الله علیه وسلم فیراهم فیه کما اخبره وصلوٰتهم فی اوقات بمواضع مختلفات جائز فی العقل کما ورد بها خبر الصادق وفی کل ذالك دلالة علی حیاتهم۔

(حیات الانبیاء للامام البیہقیؒ ص۹ مصر)

(ترجمہ) ''واقعہ معراج میں ہے کہ حضورِ اکرمؐ انبیاءِ کرامؑ کی ایک پوری جماعت کو آسمانوں میں ملے تھے، ان سے کلام فرمایا اور انھوں نے آپ سے باتیں کیں۔ یہ سب مضامین صحیح ہیں اور ایک دوسرے سے متعارض نہیں۔ ایک وقت ہے کہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھ رہے ہیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بیت المقدس تک سفرِ اسرا کرایا گیا جیسا کہ حضورِ اکرمؐ کو سفرِ اسرا پیش آیا۔ پس آپ نے وہاں بھی حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا، پھر سب پیغمبروں کو بھی آسمانوں تک (اپنے اپنے مقام میں) معراج کرایا گیا۔ جیسا کہ حضورِ اکرمؐ کو معراج ہوا۔ پس آپ نے وہاں بھی انبیاءِ کرامؑ کو دیکھا۔ پس انبیاءِ کرامؑ کا مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر نماز پڑھنا، اس پر عقلاً کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اور نقلاً اس پر قولِ صادق موجود ہے۔ اِن تمام واقعات سے انبیاءِ کرامؑ کی حیات پر دلالت ہو

ہو رہی ہے۔

المبحث الثانی

بعض اوقات کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ حیات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت تھی اور اسے واقعۂ حال لا عموم لہا کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جواباً عرض ہے کہ محدثین نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس اسے حیاتِ انبیاءؑ کے کلیّہ کے ماتحت ذکر کرتے ہیں۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے یہی مؤقف اختیار کیا ہے:۔

فان قیل هذا خاص بموسیٰؑ فلنا قد وجدنا له شاهدًا من حدیث ابی هریرةؓ اخرجه مسلم[1] ایضًا من طریق عبد الله بن الفضل عن ابی سلمة عن ابی هریرةؓ رفعه لقد رایتنی فی الحجر وقریش تسألنی عن مسرای ..... الحدیث

(فتح الباری ج۶ ص۳۷۹ کتاب الانبیاء فتح الملهم جلد ۱ ص۳۳۳)

پس اگر یہ کہا جائے کہ یہ حیات موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے تو ہم کہیں گے کہ ہمیں صحیح مسلم کی روایت سے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث اس کے شاہد کے طور پر مل گئی ہے۔ جس میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میں مقامِ حجر میں تھا اور قریش مجھ سے میرے سفرِ اسرا کے متعلق سوال کر رہے تھے۔ پھر اسی حدیث میں ہے کہ میں نے اپنے آپ کو انبیاءؑ کی پوری جماعت میں دیکھا، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام سب حضرات وہاں جمع تھے۔

محدثینِ کرامؒ میں سے یہ کسی کا مؤقف نہیں کہ یہ حیات صرف حضرت موسیٰ

---

[1] ج ۲ ص ۳۳۲ مع الفتح۔

کے ساتھ خاص تھی من ادعی فعلیہ البیان ۔

آں حضرتؐ نے ایک دفعہ بالکل عالمِ بیداری میں بحالتِ سفر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت یونسؑ[1] علیہ السلام کو وادیِ ازرق اور ثنیۂ ہرشیٰ میں لبیک پڑھتے ہوئے خاص ہیئت و لباس میں دیکھا۔ آپ نے ایک دفعہ یہ بھی فرمایا کہ میں نے وادیِ عسفان میں حضرت نوحؑ[2] علیہ السلام، حضرت ہودؑ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ وہ سرخ اونٹوں پر سوار تھے، جن کی مہاریں کھجور کی چھال کی تھیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ[3] علیہ السلام کو بھی دیکھا ہے۔ یہ واقعات لیلۃ المعراج کے نہیں، بلکہ دوسرے مواقع سے متعلق ہیں۔ پس ایسے انکشافات نہ تو لیلۃ الاسرا سے خاص ہیں اور نہ ہی یہ حیات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

المبحث الثالث

بعض اوقات یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ قبر کی حیاتِ عنصری اگر تسلیم بھی کر لی جائے تو تمام انبیاءؑ کا اس رات بیت المقدس میں اجسادِ عنصریہ سے حاضر ہونا اور پھر ملاء اعلیٰ میں اجسامِ عنصریہ سے پہنچنا ہرگز قرینِ قیاس نہیں۔ جواباً عرض ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسی جسدِ عنصری کے ساتھ دوسرے آسمان سے بیت المقدس میں آنا اگر ذہنی قیاس ہے تو دوسرے انبیائے کرامؑ کا اپنی اپنی قبور سے وہاں پہنچنا کیوں قرینِ قیاس نہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسی جسدِ عنصری سے ملاء اعلیٰ

---

[1] مسلم جلد ۱ ص ۸۰، ۸۱، بخاری کتاب المناسک جلد ۱ ص ۲۱۰ ۔

[2] رواہ ابو یعلیٰ والطبرانی قال الحافظ ابن کثیر فیہ غرابۃ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۱ ص ۱۱۹)۔

[3] اخرجہ احمد قال ابن کثیر ھذا اسناد حسن (البدایۃ ۱ ص ۱۳۸)۔

میں پہنچنا اگر محال نہیں، تو باقی انبیاے کرامؑ کے اجسادِ مطہرہ کے ساتھ وہاں پہنچنے میں کون سا استبعاد ہے؟ اگر مدارِ عقل پر ہے تو وجہِ استبعاد بتائی جائے اور اگر نقل پر ہے، تو پھر اسے استبعادِ عقلی کے طور پر پیش نہ کیا جائے، آخر نقول تو یہاں بھی موجود ہیں۔

اگر کہا جائے کہ اس رات انبیاے کرامؑ کا اصل اجسادِ عنصریہ کے ساتھ حاضر ہونا اسے لازم ہے کہ ان کی قبریں کھلیں اور ایسا ہونا "اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ" کے خلاف ہے (یعنی قیامت کو قبریں اکھاڑ دی جائیں گی)۔ اس سے پہلے ایسا کبھی وقوع میں نہیں آسکتا۔ جواباً عرض ہے کہ پھر حضرت عیسٰیؑ علیہ السلام کا معراج کی رات بیت المقدس میں آنا، کتاب و سنّت کی ان نصوص کے کیوں خلاف نہیں، جن میں ان کا آنا قیامت کے قریب مذکور ہے۔ اگر یہ کہو کہ کتاب و سنّت میں ان کی جس آمد کی خبر دی گئی ہے، وہ آمد اصلاحِ احوال اور اس زمین پر زندگی گذارنے کے لیے ہوگی اور یہ آمد قطعاً اس رات واقع نہیں ہوئی، ہم کہیں گے کہ "اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ" وغیرہ آیات میں قبروں کی جس اکھاڑ کی خبر دی گئی ہے، وہ وہ ہے جو حساب و کتاب روزِ حشر کے لیے ہوگی اور ظاہر ہے کہ لیلۃ المعراج میں انبیاے کرامؑ کا اپنی اپنی قبور سے نکل کر بیت المقدس پہنچنا ان مقاصد کے لیے نہ تھا۔ علاوہ ازیں اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس رات وہ قبورِ منورہ نہیں کھلی تھیں۔ رات کا وقت تھا، کون وہاں دیکھ رہا تھا، جو بیان کرے کہ وہ ہرگز نہ کھلی تھیں، نیز یہاں کوئی حصر نہیں، خوب سمجھ لیا جائے۔

اگر کہا جائے کہ انبیاے کرامؑ اپنی اپنی قبور سے اصل اجسامِ عنصریہ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے، تو کیا اتنا عرصہ وہ اپنی اپنی قبور سے علیحدہ رہے تھے۔ جواباً عرض ہے کہ اگر رات کے نہایت مختصر لمحوں میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم،

سِدرۃ المنتہیٰ سے ہو کر واپس آسکتے ہیں اور اس کا پتہ کسی کو نہیں چلتا، بستر بھی گرم رہتا ہے، تو باقی انبیائے کرامؑ کے اپنی اپنی قبور سے ایک نہایت مختصر لمحے کے لیے چلے جانے میں اور اس طرح چلے جانے میں کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ اس میں کون سا استحالہ لازم آتا ہے اور کون سا شرعی اصول پامال ہوتا ہے۔ انبیائے کرامؑ اس رات اگر اپنے اجسامِ عنصریہ کے ساتھ حاضر تھے، تو یہ ضروری نہیں کہ اس حاضری کے تحقق کے لیے جو اسباب کارفرما ہوں، وہ بھی سب مادّی ہوں؛ جہاتِ مختلفہ یہاں ناممکن نہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ کی مذکورہ حاضری کے لیے جو اسباب عمل میں آئے وہ روحانی تھے پس روحانی طریق سے قبروں کا کھلنا اور پھر بند ہونا یہ کوئی ایسی بات نہیں جو امرِ محال ہو اور ایسے موقعوں پر بسا اوقات زمان و مکان کی وسعتیں لپیٹ دی جاتی ہیں اور وہاں تزاحم تضاد کا وسوسہ بھی باقی نہیں رہتا۔

بابِ ھم

اگر یہ سب انکشافات حقیقت نہ ہوں، وادیِ ازرق، ثنیہ ھرشیٰ اور وادیِ عسفان کی یہ ملاقاتیں یا لیلۃ المعراج میں انبیائے کرامؑ کا بیت المقدس میں اجتماع اور ملاءِ اعلیٰ کے مذاکرات، یہ سب اُمور ابدانِ مثالیہ سے متعلق ہوں اور یہ سب مشاہداتِ عالمِ مثال کے قرار دیے جائیں، تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبرِ شریف میں نماز پڑھنا یہ بھی ایک عالمِ مثال ہی کا واقعہ تھا۔ اُمورِ مذکورہ بالا کو اگر ان تاویلات پر بھی محمول کر دیا جائے، جو ان کے تذکروں میں بطورِ احتمال ذکر کی گئی ہیں، تو بھی یہ مقصودِ کلام قطعاً متاثر نہیں ہوتا کہ انبیائے کرامؑ کو اپنی اپنی قبور میں جو حیات حاصل ہے، وہ عنصری اور جسمانی ہے، نیز یہ کہ وہ تلذّذاً مصروفِ عبادت ہیں۔

ہاں اگر کہا جائے کہ مذکورہ انکشافات میں اور معراج کی ملاقاتوں میں نہ ابدانِ

مثالیہ تھے اور نہ اجسام عنصریہ، بلکہ ان انبیاے کرام کی ارواح قدسیہ ہی متمثل[1] ہو رہی تھیں۔ تو پھر یہ وہم ہو سکتا ہے کہ پھر ان کے اجسام عنصریہ قبورِ شریفہ میں زندہ نہ ہوں گے اس صورت میں ہم عرض کریں گے کہ اگر ارواح مقدسہ رفیقِ اعلیٰ یا حظیرۂ قدسیہ کو اپنا مستقر بنا کر وہاں سے اجسامِ قبریہ پر اپنی تاثیر[2] دکھا سکتی ہیں اور انھیں فائز الحیات کر سکتی ہیں کہ وہ اجسام عنصریہ بھی اپنی اپنی قبور میں زندہ ہوں، تو جہاں وہ ارواح متمثل بصورتِ جسمیہ ہو رہی ہوں، وہاں سے اجسامِ قبریہ پر کیوں پرتو نہیں ڈال سکتیں اور وہاں اتصالِ روح کے نتیجے میں حیات کا تحقق کیوں نہیں ہو سکتا۔

نوٹ :۔

اس بحث میں ہمارا مقصود ان انکشافات کی تحقیق اس کے ضمن میں مختلف احتمالات کی تطبیق یا کسی ایک توجیہہ کا اثبات یا ابطال نہیں، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنی قبرِ شریف میں زندہ ہونے کے بیان میں جو جو مغالطات عوام کے سامنے آئے ہیں، ان کے الزامی جوابات اور ایرادِ استبعاد میں دلائل امکانات ہیں نہ ہر صورتِ ممکنہ کے وقوع کا دعوٰی ہے اور نہ اس کی ضرورت! کہنا یہ ہے کہ اصل مدعا کسی بھی صورتِ واقعہ سے متاثر نہیں ہوتا۔

المبحث الرابع

یہ بھی سننے میں آیا ہے[3] کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنی قبر شریف میں نماز پڑھنے کی روایت اگرچہ صحیح مسلم میں موجود ہے لیکن قرآنِ پاک کے خلاف ہونے کی وجہ سے لائق

---

[1] قال الشیخ الاکبر فی الفصوص الروح یتشکل باشکال مختلفۃ (العرف الشذی ص۱)۔

[2] کما ذھب الیہ ابن القیم وراجع لہ کتاب الروح ص۴۲ وزاد المعاد جلد ۲ ص۴۹۔

[3] یہ روئداد ملتان کے ایک درس کی ہے، جو ہمارے محترم دوست ڈاکٹر فیروز الدین صاحب (اندرون لوہاری گیٹ) نے ہمیں سنائی تھی۔

اعتماد نہیں ۔ قرآنِ پاک میں ہے :۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۔ پ۱۴ — اور بندگی کیے جا اپنے رب کی یہاں تک کہ تجھے وفات آجائے ۔

پس جب عبادت مَوت تک کے لیے ہی ہے تو قبر میں عبادت کرنے اور نمازیں پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ، وہ ہرگز دار العمل نہیں ۔ پس یہ حدیث جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبرِ منورہ میں نماز پڑھنا مذکور ہے ، قرآن کے خلاف ہے ۔ (معاذ اللہ ، ثم معاذ اللہ !)

جواباً عرض ہے کہ " دار العمل " کے بعد " وجوبِ عمل " کا انقطاع ہے " نفسِ عمل " کا نہیں قرآنِ عزیز نے جس عبادت کا حکم دیا ہے ۔ اس کی " انتہائے مدت " موت ہے ۔ اس کے بعد عبادت کا نہ حکم ہے اور نہ کسی پر یہ اس عالم میں واجب ہے ۔ انبیائے کرام جو عالمِ برزخ میں (اپنی اپنی قبور میں) نمازیں پڑھتے ہیں ، وہ تلذذاً پڑھتے ہیں وجوباً نہیں ۔

قال القرطبی حُبِّبَتْ الیھم العبادة فھم یتعبّدون بما یجدونه من دواعی انفسھم لا بما یُلزمون به — راجع له الفتح ص۳۴۳

خاتم المحدثین حضرت مولانا السید انور شاہؒ فرماتے ہیں :۔

ان کثیراً من الاعمال قد ثبتت فی القبور کالاذان والاقامة عند الدارمی وقرأة القرآن عند الترمذی ۔ (فیض الباری جلد ۱ ص۱۸۳ مصر)

(ترجمہ) بہت سے اعمالِ قبور شریفہ میں بھی ثابت ہوتے ہیں ۔ سُننِ دارمی کی روایت سے قبر میں اذان واقامت اور ترمذی شریف کی روایت سے قبر میں تلاوتِ قرآن کا ثبوت ملتا ہے ۔

پس جس طرح " صَلُّوْا خَمْسَكُمْ " (تم اپنی پانچ نمازیں پڑھ لیا کرو) میں تہجد کی نفی نہیں ، اسی طرح ورودِ موت کے بعد قبر کی زندگی میں نمازیں پڑھنا ، تلاوت کرنا

"وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" کے خلاف نہیں۔ مقرّبینِ ایزدی کو عبادت میں اس قدر لذت ملتی ہے کہ محبوب ہونہ ہو، وہ عبادت کو اپنی طبیعت بنا چکے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآنِ عزیز جنت میں بھی دُعا و ذکر کی خبر دیتا ہے :-

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (یونس : پ ۱۱)

ان کی دُعا اس جگہ یہ ہے کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے اور ان کا تحفہ ایک دوسرے کو سلام کا ہوگا اور خاتمہ ان کی دُعا کا اس پر ہے کہ سب تعریفیں سب جہانوں کے پروردگار کے لیے ہی ہیں۔

پس جب دُعا جو "مُخُّ الْعِبَادَةِ" ہے، یعنی ساری عبادت کا مغز ہے۔ وہ مرنے کے بعد ثابت ہے، تو پھر یہ کہنا کہ قرآنِ عزیز اس 'دارالعمل' کے بعد کسی قسم کی عبادت یا ذکر و حمد کی خبر نہیں دیتا، قرآنِ پاک پر اور خود اسلام کے نظریۂ مابعد الموت پر کس قدر ظلم ہے ؎

فریبِ کشمکشِ عقل دیدنی دارد
کہ میرِ قافلہ و ذوقِ راہزنی دارد

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :-

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ .... وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (پ ۲۴ زمر)

اور جنتی کہیں گے الحمد للہ جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور وارث کیا ہمیں اس زمین کا اور ہر طرف سے الحمد للہ رب العٰلمین کی آوازیں آئیں گی۔

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۔ (پ ۲۲ سبا)

اور آخرت میں بھی اُسی کی ہی حمد ہوگی اور وہی ہے حکیم و خبیر۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

اور جنتی کہیں گے الحمد للہ سب تعریفیں

هٰذَا اَنَا لِھٰذَا۔ اُسی ذات کے لیے ہیں۔ جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا۔ (پ اعراف)

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ حضورِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:۔

یلھمون التسبیح و التحمید (مسلم) اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد اُن کے دلوں میں ڈال دی جائے گی۔

پھر حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

یسبحون اللہ بُکرۃً و عَشِیًّا (متفق علیہ) وہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کہیں گے۔

"فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ" میں تسبیح و تحمید اور استغفار کا حکم تھا۔ اس عالم میں وجوباً اس پر عمل ہوتا رہا۔ بعد ازاں تلذذاً تسبیح و تحمید اور دعا و استغفار کا سلسلہ جاری ہے۔ تسبیح و تحمید کا بیان ہو چکا۔ اب استغفار بھی دیکھیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

حیاتی خیر لکم و مماتی خیر لکم تعرض علی اعمالکم فما کان من حسن حمدت اللہ علیہ وما کان من سیئ استغفرت اللہ لکم۔ رواہ البزار باسناد جید (فتح الملھم جلد ۱ ص۱۳)۔

وکذا عند البزار بسندٍ جید عن ابن مسعود رفعہ (فھرست عقیدۃ الاسلام مولٰینا انور شاہؒ ص۱۱)۔

بزار برجال صحیح از عبداللہ بن مسعودؓ می آرد (جذب القلوب ص۱۸۲ محدث دھلویؒ)۔

(ترجمہ) میری یہ زندگی بھی تمھارے لیے خیر ہے اور بعد الوفات بھی میری

حالت تمہارے لیے خیر ہے۔ تمہارے اعمال مجھ پر پیش ہوتے رہیں گے۔ پس جو اچھے ہوں گے، تو یہ میرے لیے سامانِ تحمید ہوگا اور جو اعمال اچھے نہ ہوں گے، اس پر میں دعائے استغفار کرتا رہوں گا۔"

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں :-

"مجموعِ روایات سے علاوہ فضیلتِ حیات واکرام ملٰئکہ کے برزخ میں آپ کے (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ مشاغل ثابت ہیں (۱) اعمالِ امّت کا ملاحظہ فرمانا۔ (۲) نماز پڑھنا۔ (۳) غذا مناسب اس عالم کے نوش فرمانا۔ (۴) سلام کا سننا نزدیک سے خود اور دور سے بذریعہ ملٰئکہ۔ (۵) سلام کا جواب دینا۔ یہ تو دائماً ثابت ہیں اور احیاناً بعض خواصِ امّت سے یقظۃً میں آپ کا کلام اور ہدایت فرمانا بھی آثار و اخبار میں مذکور ہے اور حالتِ رویا اور کشف میں تو ایسے واقعات حصر و احصاء سے متجاوز ہیں اور ان مشاغل کے ایک وقت میں اجتماع سے تزاحم کا وسوسہ نہ کیا جائے، کیونکہ برزخ میں روح کو پھر خصوصاً روحِ مبارک کو بہت وسعت ہوتی ہے؛ مگر اس وسعت سے امورِ غیر ثابتہ بالدلیل الصحیح یعنی منفیہ یا مسکوت عنہا کو ثابت یا ثابتہ احیاناً کو ثابت بالدوام ماننا جائز نہیں ہوگا۔ خوب سمجھ لیا جائے۔" (نشر الطیب)

خلاصۂ مبحث یہی ہے کہ یہ حدیث صلوٰۃ موسٰی فی القبر بالکل صحیح ہے اور ہرگز قرآنِ پاک کے خلاف نہیں، اسی طرح لیلۃ الاسرٰی میں انبیائے کرامؑ کا نمازیں پڑھنا اور پھر آں حضرتؐ کا ان کی امامت کرانا، یہ بھی احادیثِ صحیحہ سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب!

المبحث الخامس

یہ اعتراض بھی سُننے میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قبر میں نماز پڑھنے کی حدیث حضرت انسؓ نے آں حضرتؐ سے براہِ راست نہیں سُنی ۔ اس لیے کہ بعض سندوں میں عن انسؓ عن بعض اصحاب النبیؐ قال ... الحدیث کے الفاظ ملتے ہیں ۔ پس جب تک اس صحابیؓ کے نام کا پتہ نہ ملے، جس سے حضرت انسؓ نے یہ حدیث سُنی تھی، اُس وقت تک اُسے حُجّۃ نہیں سمجھا جاسکتا ۔

جواباً عرض ہے کہ صحیح مُسلم کی روایت میں حضرت انسؓ براہِ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کو نقل کر رہے ہیں ۔ پس جو سند اس عالی سند سے ٹکرائے گی، ناقابلِ اعتماد ہوگی ؛ ثانیاً امام نسائیؒ جنھوں نے دونوں طریقِ اسناد پیش کیے ہیں، خود اسی روایت کو ترجیح دے رہے ہیں، جس میں حضرت انسؓ براہ راست حضورِ اکرمؐ سے اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں :-

قال ابو عبد الرحمٰن النسائیؒ ھذا اولی بالصواب عندنا (سنن نسائیؒ جلد ا ص۱۸۵) ۔

ثالثاً اگر ان دونوں حقیقتوں کو نظر انداز کر دیں، تو غایت ما فی الباب لازم آتا ہے کہ یہ حدیث مُرسلاتِ صحابہؓ میں شمار ہو اور ظاہر ہے کہ مُرسلات صحابہؓ بالاتفاق موصولات کے حکم میں ہیں اور ان لوگوں کے نزدیک بھی معتبر ہیں، جو مُرسل کے قبول کرنے میں کلام کرتے ہیں ۔ الفیہ عراقی میں ہے :-

اما الذی ارسلہ الصحابی فحکمہ الوصل علی الصواب

الفیہ سیوطیؒ میں ہے ؎

و مرسل الصاحب وصل فی الاصح

تحریر میں ہے :۔

فلا یضر اذ لا یرسل الا عن صحابی (التحریر لابن الہمام ص۳۳۷ مصر)

شیخ الاسلام فرماتے ہیں :۔

"اما مراسیل الصحابۃ رض فحکمھا حکم الموصول علی المشہور الذی ذھب الیہ الجمہور"۔ (مقدمہ فتح الملہم ص۳۲)

خلاصہ سب دلایل کا یہی ہے کہ :۔

صحابۂ کرام رض کی مُرسلات (یعنی وہ روایات جو روایت کرنے والے صحابی رض نے خود حضور ؐ سے نہ سُنی ہوں، بلکہ کسی اَور صحابی رض سے سُنا ہو کہ حضور ؐ نے ایسا ایسا فرمایا تھا اَور اب وہ اِس دوسرے صحابی رض کی نشان دہی ضروری نہ سمجھتے ہوئے اِن اَحادیث کو براہِ راست حضور ؐ سے ہی روایت کر رہے ہوں تو) اِن کا حکم یہی ہے کہ انھیں متّصل روایات قرار دیا جائے، اَور یہی جمہور محدّثین کا فیصلہ ہے۔

المبحث السّادس

'وادیِ ازرق' اَور 'لیلۃ الاسراء' کے مشاہدات اگر حقیقت نہ ہوں مثالی ہی ہوں، تو بھی مقصودِ کلام متاثّر نہیں ہوتا۔

مذکورہ سابقہ اِنکشافات برزخیہ میں یہ اختلاف درپیش ہے کہ اجسامِ مرئیہ واقعی حضراتِ انبیا علیہم السلام ہی تھے یا یہ فقط ان کے مثالی اجسام تھے؟ اِس میں کئی موقف اختیار کیے جاتے ہیں :۔

ا۔حضور ؐ نے جب فرما دیا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے تو واقعی آپ ؐ نے انھیں دیکھا ہے، اس کا اِدراک و شعور اگر ہمیں نہ بھی ہوسکے تو بھی یقین کامل ہے کہ آپ ؐ نے جنھیں دیکھنے کا دعوٰی فرمایا،

آپ نے واقعی انہیں ہی دیکھا تھا اور وہ واقعۃً وُہی حضرات تھے، جن کا آپ نے ذکر فرمایا۔ اُس عالمِ برزخ میں انبیاے کرام جسمانی طور پر زندہ ہیں اور جس کے لیے بھی کبھی یہ پردے اُٹھائے گئے، اُس نے ان نفوسِ قدسیہ کو اِس دُنیا کی جسمانیات قبر یا کعبہ وغیرہما سے متعلق ہی پایا۔

یہ مؤقف کہ ان انکشافات میں اشخاصِ مرئیہ صرف مثالی وُجُود تھے یا ان کی ارواح (تعلق بالبدن المدفون کے باوجود) یہاں متمثّل ہو رہی تھیں، یقیناً صرف عن الظاہر ہے اور یہ طے شدہ تحقیق ہے کہ ہر شے اپنی اصل پر قائم ہے، جب تک کہ اس کا حقیقت پر محمول ہونا شرعاً یا عقلاً متعذر نہ ہوں۔ صرف عن الظاہر کے لیے اصل شرعی مطلوب ہے اور وہ بھی کم از کم اسی پایہ کی ہونی چاہیے، جس پائے کا آپ کا یہ دعوٰی شریفہ ہے کہ میں نے ان ان انبیاؑ کو فلاں فلاں موقع پر دیکھا تھا۔ اگر اس درجہ کی اصل اس مقام پر موجود نہیں، تو ظاہر ہے کہ اصل دعوے کو اپنے اصل ہی پر رہنے دیا جائے۔

اس موقف کے قائلین پر ایک الزام

جو اہلِ علم حضرات ان انکشافات کے حقیقت پر محمول ہونے کا مسلک رکھتے ہیں، ان کی تردید میں یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ سلف صالحین میں سے یہ کسی کا مسلک نہ تھا؛ ان اجسامِ مدفونہ سے متعلق سماع و عدمِ سماع یا شعُور و عدمِ شعُور کے مباحث تو تھے، لیکن ان کے متحرک ہونے یا ایک جگہ سے دُوسری جگہ جانے کا دعوٰی سلف میں سے کسی نے نہیں کیا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس الزام میں قلبِ موضوع، حقائق کو برعکس بیان کرنے، موجود کو غیر موجود کہنے اور غیر موجود کو موجُود کہنے سے کام لیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ انبیاے کرام کے اجسامِ مدفونہ سے متعلق سماع یا عدمِ سماع اور شعور یا عدمِ شعُور

کے مباحث تو حضرات اہل السنت میں کہیں نہیں ملتے اور اس کے برعکس ان اجسامِ مدفونہ کے متحرک ہونے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کا قول سلفِ صالحین میں موجود ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابنِ حجر عسقلانی رح فتح الباری باب المعراج میں لکھتے ہیں :-

واستشكل رؤيته الانبياء في السموات مع ان اجسادهم مستقرة في قبورهم بالارض و اجيب بان ارواحهم تشكلت بصور اجسادهم او احضرت اجسادهم لملاقات النبي صلى الله عليه وسلم تلك الليلة تشريفاً و تكريماً ويؤيده حديث عبد الرحمن بن هاشم عن انس رض ففيه وبعث له آدم ومن دونه من الانبياء۔

یہ اشکال پیش کیا گیا ہے کہ انبیائے کرام کے اجسادِ کریمہ تو اپنی اپنی قبروں میں استقرار پذیر ہیں۔ پھر حضور کا انھیں معراج کی رات آسمانوں پر دیکھنا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی ارواحِ قدسیہ اس رات متجسد کر دی گئی تھیں۔ یا ان کے اجسادِ کریمہ ہی (ان کی قبروں سے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف و تکریم کے لیے لا حاضر کر دیے گئے تھے اور اس دوسری صورت کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرتِ انس رض سے منقول ہے۔

(فتح الباری جلد ۷ ص ۱۹۹ مصر)

حافظ ابنِ حجر عسقلانی رح کا اندازِ بیان بتلا رہا ہے کہ وہ اس دوسری صورت ہی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ خاتمۃ الحفاظ کے علاوہ اور بھی کئی محدثین سے یہ موقف منقول ہے۔ حیرت در حیرت ہے کہ جو مباحث موجود ہیں، ان کے وجود ہی سے انکار ہو اور جن کا حضراتِ اہلِ سنت میں نام و نشان بھی نہیں تھا، ان کے امرِ واقع ہونے کا دعویٰ کر دیا جائے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

۲۔ بعض دوسرے حضرات کا موقف یہ ہے :۔

حضورؐ نے جن انبیائے کرامؑ کے متعلق فرمایا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے، حضورؐ نے انھیں واقعی نہ دیکھا تھا، بلکہ یا

(۱) ان انبیاءؑ کی ارواحِ قدسیہ صورتِ جسم میں متمثل ہو رہی تھیں یا

(۲) ان انبیائے کرامؑ کے ان اجسام کا مشاہدہ ہو رہا تھا، جو عالمِ مثال میں قائم تھے اور یا

(۳) انھیں اس عالم سے انتقال فرمانے کے بعد کوئی اور جسم ملا ہوا ہے اور انبیائے کرامؑ کی یہ حاضریاں انھی اجسام کے ساتھ تھیں۔

ہمیں ان احتمالات کے مابین محاکمہ کرنا نہیں۔ امرِ واقع خواہ کوئی صورت ہو، اس عقیدے کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ انبیائے کرامؑ کے اجسادِ عنصریہ اپنی قبورِ شریفہ میں بالکل بے حس و بے شعور ہیں۔

اگر یہ نفوسِ قدسیہ اپنی وفاتِ شریفہ کے بعد بھی کہیں کہیں اپنے اصل جسدِ عنصری سے چلتے پھرتے دکھائی دیں اور یہ رفت و آمد فوق الاسباب بغیر انشقاقِ قبور کے ہو اور اس اعتبار سے روحانی ہو کہ زمان و مکان کی وسعتیں، جیسا کہ معراج کی رات واقع ہوا، سمٹ گئی ہوں یعنی اپنی قبور سے جدائی بھی کسی خاص محسوس درجے میں نہ ہو تو سوال یہ ہے کہ :۔

ربّ العزت کے لیے ایسے حالات پیدا کر دینا اور پھر روحانی اور جسمانی اعتبارات کو مختلف جہات سے اس عالمِ برزخ میں جمع کر دینا کیا امرِ ناممکن ہے؟ یا ان جزئیات میں سے کوئی جزئیہ کتاب و سنت کی کسی تصریح سے متصادم ہوتا ہے؟ یا یہاں کوئی پہلو ایسا بھی اختیار کیا گیا، جس کی نظیر پہلے کے کسی بھی واقعہ میں نہ ہو؟ ـــــ جواب یقیناً نفی میں ہو گا!

پیشِ نظر رہے کہ ان تفصیلات کو ہم مدعی ہو کر اپنے دلائل میں پیش نہیں کر رہے، بلکہ بات یہ چلی تھی کہ آں حضرتؐ کا یہ فرمانا کہ میں نے فلاں فلاں پیغمبرؑ کو فلاں فلاں جگہ دیکھا تھا، آیا حقیقت پر محمول ہیں یا اسے حقیقت پر محمول کرنا شرعاً اور عقلاً محال ہے، بصورتِ ثانی ہم مجبور ہوں گے کہ آپؐ کے اس ارشاد کو اس کے ظاہر سے پھیر کر تمثیل مجاز وغیرہ پر محمول کریں۔ ہم نے یہ تفصیل اس لیے کی ہے کہ آں حضرتؐ کے ان ارشادات کو ان امکانات، احتمالات اور نظائر کے ہوتے ہوئے ان کے ظاہر پر محمول کرنا شرعاً اور عقلاً ہرگز ناممکن نہیں اور واضح ہے کہ امکان ثابت کرنے کے لیے یا امتناع توڑنے کے لیے صرف صورتِ ممکنہ کافی ہوتی ہے، صورتِ واقعہ کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔

اگر ان برزخی مشاہدات میں اجسامِ مرئیہ اصل اجسامِ عنصریہ نہ ہوں؛ بلکہ عالمِ مثال کے مثالی اجسام ہوں، تو بھی اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اصل اجسامِ عنصریہ اپنی اپنی قبور میں بالکل بے حس و بے شعور ہوں اور انبیائے کرامؑ اپنے اپنے روضات میں فائز الحیات نہ ہوں؛ اس لیے کہ ان دونوں معاملات میں کوئی تصادم نہیں، ہر معاملہ اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے حالات کے مطابق ہو رہا ہے۔

ہاں اگر یہ تشکل عالمِ مثال کا نہ ہو، بلکہ اصل ارواحِ قدسیہ ہی متمثل بصورتِ جسمیہ ہو رہی ہوں۔ جیسا کہ علامہ قرطبیؒ وغیرہ کی رائے ہے، تو پھر یہاں وہ موقف اختیار کرنا پڑتا ہے کہ عالمِ برزخ میں ان ارواحِ طیبہ کو عظیم وسعت حاصل ہوتی ہے ہرگز بعید نہیں کہ یہ ارواحِ قدسیہ اجسامِ عنصریہ سے بھی بالکل بے تعلق نہ ہوں اور ان کا پرتو یہاں بھی صورتِ جسمیہ میں متمثل ہو رہا ہو یا وہ ارواحِ اصلیہ ان مقامات پر متمثل بصورتِ جسمیہ ہو رہی ہوں اور ان کا اجسامِ قبریہ پر بھی پرتو پڑ رہا ہو جس سے وہ صفتِ حیات سے متصف ہوں۔ اگر روحِ پاک رفیقِ اعلیٰ یا حظیرۂ قدسیہ کو اپنا مستقر

بنا کر قبورِ شریفہ میں رکھے اجسام پر پرتوِ حیات ڈال سکتی ہے۔ جیسا کہ حافظ ابنِ قیمؒ کی رائے ہے، تو ارواحِ متمثلہ یہاں قریب کے مقامات سے اجسامِ قبریہ پر تاثیر کیوں نہیں کر سکتیں؟

حق یہ ہے کہ احوالِ برزخ پر اس عالم کی نظر و فکر کے پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ جن حضرات کا یہ موقف ہے کہ ان انکشافات میں ارواحِ قدسیہ ہی متمثل بصورتِ جسمیہ ہو رہی تھیں، آخر وہ بھی تو رفیقِ اعلیٰ یا حظیرۂ قدسیہ ہی کو روح کا محلِ استقرار قرار دیتے ہیں۔ جو جواب ان کا ان احوال میں ارواحِ قدسیہ کے علیین سے جدا ہونے کا ہوگا، وہی جواب ان کا سمجھ لیجیے، جو ارواحِ قدسیہ کو قبر کے اجسامِ عنصریہ سے متعلق مان کر ان مشاہدات میں تمثلِ ارواح کا دعوےٰ کر رہے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ صورتِ واقعہ کیا تھی اور کیا نہیں اور نہ اس وقت یہ ہمارا موضوع ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مذکورہ احتمالات میں سے کوئی بھی جانب اختیار کر لی جائے، یہ حقیقت قطعاً متاثر نہیں ہوتی کہ انبیائے کرامؑ کے اجسامِ عنصریہ اپنی اپنی قبور میں ہرگز بے حس و بے شعور نہیں، بلکہ وہ فائز الحیات ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کا اپنے روضۂ شریفہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اور حضورؐ کا ان کی خبر دینا ان اختلافات سے قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ حدیثِ صلوٰۃِ موسیٰؑ پر حاشیہ سننِ نسائی "زہر الربیٰ" سے منقول ہے:۔

قال الشیخ بدر الدین ھٰذا صریح فی اثبات الحیوٰۃ لموسیٰ علیہ السلام فی قبرہ فانہ وصفہ بالصلوٰۃ وانہ قائم ومثل ذلک لا یوصف بہ الروح وانما یوصف بہ الجسد وفی تخصیصہ بالقبر دلیل علیٰ ھٰذا فانہ لو کان من اوصاف الروح لم یحتج لتخصیصہ بالقبر و قال الشیخ تقی الدین السبکی فی ھٰذا الحدیث " الصلوٰۃ تستدعی جسدًا

حقًا" ولا یلزم من کونها حیوٰۃ حقیقیۃ ان تکون الابدان معها کما کانت فی الدنیا من الاحتیاج الی الطعام والشراب وغیر ذٰلک من صفات الاجسام التی نشاهدها بل یکون لها حکم آخر۔

(حاشیہ نسائی جلد ۱ ص۱۸۵ باب صلوٰۃ نبی اللہ موسیٰ وذکر الاختلاف علی سلیمان التیمی)۔

(ترجمہ) "شیخ بدرالدینؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت موسیٰؑ کے اپنی قبر میں زندہ ہونے پر صریح دلیل ہے" کیونکہ حضور اکرمؐ نے آپؑ کو نماز سے موصوف بتلایا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے محض روح موصوف نہیں ہوتی۔ نماز جیسے عمل سے متصف ہونا تو جسم کا کام ہے" صرف روح کا نہیں" نیز اس عمل کے قبر سے متعلق ہونے میں بھی "حیات فی القبر" پر دلیل ہے (یعنی یہ عمل جسدِ عنصری کا ہے، کیونکہ قبر میں تو جسدِ عنصری ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی اور جسدِ مثالی پیشِ نظر ہوتا تو پھر اس عمل صلوٰۃ کے مخصوص بالقبر ہونے کی حاجت نہ تھی) پس اگر یہ عملِ صلوٰۃ (یا تجسد عمل الصلوٰۃ) روح کی صفت ہوتی، تو اس کی تخصیص قبر سے بالکل نہ ہوتی۔ شیخ تقی الدین السبکیؒ بھی اس حدیث کا یہی مطلب بیان کرتے ہیں کہ "نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے"۔ پیشِ نظر رہے کہ حیاتِ حقیقی کے ثبوت سے یہ چیز لازم نہیں آتی کہ وہاں بھی ابدان اسی طرح کھانے پینے کے محتاج ہوں، جس طرح کہ اس دُنیا میں تھے، جیسا کہ ہم صفاتِ اجسام کو ہر روز دیکھتے ہیں، بلکہ اس جہان کے احکام اس سے مختلف ہیں (یعنی حیاتِ جسمانی کے ساتھ وہاں رزقِ مادّی نہیں، بلکہ معنوی ہے۔ حیاتِ دُنیاوی صرف تعلق بالبدن الدنیوی کی بنا پر ہے۔ تعلق بالرزق کی بنا پر وہ حیات روحانی ہے اور تعلق بالظرف کے پیشِ نظر برزخی ہے)"۔

عالمِ برزخ کی حقیقتیں اس جہان والوں سے مخفی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب

کسی پر انھیں منکشف فرمانا چاہتے ہیں تو پہلے اس میں برزخی مشاہدات کی صلاحیت پیدا فرما دیتے ہیں۔ پھر جب ان مخفی حقائق سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، تو وہ نفوسِ قدسیہ دیکھ لیتے ہیں کہ کس کس کی حیاتِ برزخی مضمحل ہے اور کس کس کی روح وجسم فائز الحیات ہیں۔ اِس عالم میں رہتے ہوئے اُس عالم کی جھلکیں دیکھ پانا نفوسِ قدسیہ کے پیشِ نظر ہرگز محال نہیں۔ کشف القبور سے تو بارہا غیر انبیاء بھی متصف ہوتے رہے ہیں اور ہوتے ہیں۔ آں حضرتؐ نے بارہا مختلف قبروں کو دیکھا اور اُن کے احوال مختلف لوگوں کے سامنے بیان فرمائے۔ یہ اطلاع وحی کے بجائے کشف پر مبنی ہوتی تھی ؎

چہ گویم شرح آں حالت کہ در گفتن نمی آید!

ایسے انکشافات صرف لیلۃ المعراج ہی سے خاص نہ تھے۔ آپ نے بارہا اِسی عالم میں ہوتے ہوئے اُس عالمِ برزخ میں انبیائے گزشتہ کو دیکھا ان کا زندوں جیسے کاموں میں اشتغال ——— جیسے وادی سے گزرتے یا گھاٹی سے اترتے لبیک لبیک کہنا، نمازیں پڑھنا اور تحیۃ وسلام کہنا، یہ سب اُمور معراج کے علاوہ اور بہت سے انکشافات کا پتہ دے رہے ہیں۔ اور اس دُنیا سے ایک تعلق اور رابطہ ثابت کر رہے ہیں۔ اس کے پورے خدوخال کیا ہیں، اس پر ایک پردہ ہے جو نہ ہٹتا ہے نہ پھٹتا ہے اور یہی برزخیت ہے۔ ہاں کبھی کبھار جو دیکھا یا سُنا جاتا ہے۔ یہ محض اُس عالم کی کچھ جھلکیاں ہیں یا بعض نفوسِ قدسیہ کے مشاہدات اور انکشافات!

انبیائے کرامؑ کے ایسے مشاہدات میں بعض ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن سے تمثلِ ارواح یا ابدانِ مثالیہ کی بہت گنجائش نکلتی ہے؛ جیسے کانی انظر وغیرہ، لیکن ان الفاظ کو ان انکشافات سے اٹھا کر ان حقائق پر بھی منطبق کرنا جہاں حقیقت مراد لینے سے نہ عقلِ سلیم سے تصادم ہوتا ہے اور نہ کسی نقلِ صحیح کی مخالفت لازم آتی ہے کس قدر زیادتی ہے! واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

الفصل الثالث

وفیہ ستّۃ من المباحث

"عن انس بن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِہِمْ یُصَلُّوْنَ"۔

مسند ابی یعلی (جامع صغیر ص۱۰۳ مصر) حیاتہ الانبیاء للامام البیہقی ص۳ مصر۔

ابن بزار (مجمع الفوائد جلد ۲ ص۱۷۶ میرٹھ) ابن عدی (شفاء السقام ص۱۳۴)

(ترجمہ) "حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء کرامؑ اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں"۔

حیاتِ انبیاءؑ کی قبورِ شریفہ سے صریح نسبت کے بعد اس وسوسے کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ انبیاء کرامؑ صرف رفیقِ اعلیٰ اور علیین میں فائز الحیات ہیں اور ان کی حیاتِ شریفہ کو اجسامِ قبریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وقد مرّ تفصیلہ من حاشیۃ سنن النسائیؒ۔

آں حضرتؐ کا یہ ارشاد محدثین کرامؒ نے مختلف طرق سے نقل فرمایا ہے۔ ان میں نچلے راوی متعدد ہیں اور مختلف ہیں، لیکن ان سب کا اشتراک اوپر کے ہاتھ سلسلۂ اسناد پر جا قائم ہوتا ہے۔

المستلم بن سعید عن الحجاج الاسود عن ثابت البنانی عن انس بن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پس تمام محققین کا نقطۂ نظر انہی راویوں کی توثیق ہے، یعنی یہ رواتِ حدیث قابلِ اعتماد ہیں تو حدیث ثابت ہے۔ ان کے بعد کے نچلے راویوں میں اگر کوئی اختلاف ہو

بھی، تو مقصودِ توثیق قطعاً متاثر نہیں ہوتا، اِس لیے کہ طرق مختلف اور متعدد ہیں۔

حافظ ابو یعلیٰؒ کا سلسلۂ اسناد یہ ہے :۔

حدثنا ابو الجہم[۱] الازرق بن علی حدثنا یحیی بن ابی[۲] بکیر حدثنا المستلم[۳] بن سعید عن الحجاج[۴] عن ثابت[۵] عن انس[۶] رضی قال قال رسول اللہ ﷺ ...... الحدیث۔

یہ سلسلۂ اسناد امام بیہقیؒ کو اس طریق سے پہنچتا ہے :۔

اخبرنا الثقۃ[۱] من اھل العلم قال انبأنا ابو عمرو بن[۲] حمدان قال انبأنا ابو یعلیٰ[۳] الموصلی حدثنا ابو الجہم[۴] الازرق۔

حافظ ابو یعلیٰؒ کے سلسلۂ اسناد میں سب راوی معروف، قابلِ اعتماد اور متصل ہیں۔ اب حافظ بیہقیؒ کی سند حافظ ابو یعلیٰؒ تک جن دو راویوں سے پہنچتی ہے، اگر وہ نہ بھی ہوتے اور امام بیہقیؒ تک یہ حدیث نہ بھی پہنچی ہوتی، تو بھی یہ حدیث صحیح اور صالح الاحتجاج تھی اور حافظ ابو یعلیٰؒ کا اسے سندِ صحیح سے لے آنا اس کی حجیت کے لیے کافی تھا۔ کس قدر افسوس ہے کہ امام بیہقیؒ کے اس کہنے پر کہ "اخبرنا الثقۃ من اھل العلم" اس حدیث کے پورے اسناد پر مجہول ہونے کا حکم لگا دیا جاتا ہے، حالانکہ اس سند میں امام بیہقیؒ کے شیخ روایت بھی حکماً مجہول نہیں۔ کیونکہ مجہول وہ ہوتا ہے، جسے کسی امامِ حدیث نے ثقہ نہ کہا ہو اور یہاں خود امام بیہقیؒ اسے اسی سند میں ثقہ قرار دے رہے ہیں۔ راوی کا تعین اور اس کے حالات کی تفصیل اسی لیے مطلوب ہوتی ہے کہ اس کی ثقاہت کا پتہ چلے اور اس مقام پر نہ صرف اس کی توثیق ہے، بلکہ

---

[۱] پیشِ نظر رہے کہ توثیقِ رجال میں حافظ بیہقیؒ کا مسلک دارقطنیؒ اور ابن حبانؒ والا نہیں کہ فقط راویوں کی روایت اس کے لیے کافی ہو، بلکہ امام بیہقیؒ اس باب میں جمہور محدثینؒ کے ساتھ ہیں۔ پس ان کی توثیق کچھ کم وزن نہیں رکھتی؛ بالخصوص جبکہ اس روایت سے انہیں کسی خاص فقہی موقف کی کوئی تائید مقصود نہ ہو۔

امام حدیث حافظ بیہقیؒ اس کے اہل العلم ہونے کا بھی اعلان کر رہے ہیں۔

خیر! اسے بھی جانے دیجیے۔ حافظ ابویعلیؒ کے سلسلۂ اسناد کو لیجیے، نچلے رواۃ میں اگر کوئی اختلاف بھی ہو تو بھی اُوپر کے رواۃ کی توثیق بالکل متاثر نہیں ہوتی، کیونکہ سب کے سب راوی معروف اور ثقہ ہیں اور سب میں اتصال موجود ہے۔

محدث کبیر حافظ ہیثمیؒ فرماتے ہیں :-

رجال ابی یعلی ثقات (مجمع الزوائد)۔

خلاصہ یہ کہ ہم ان ہی راویوں کی تعدیل بیان کریں گے، جو اُوپر کے ہیں اور جن پر حدیث کا دار و مدار ہے۔

المبحث الاول

فی احوال رواۃ

۱- ابوالجہم الازرق :-

بن علی الحنفی ابوالجہم صدوق یغرب من الحادیۃ عشرۃ (تقریب ص۳۱)

یعنی صدوق اور سچے راوی حدیث ہیں۔

۲- یحیی بن ابی بکیر (واسمہ نسر الکرمانی کوفی الاصل نزل بغداد) :-

ثقہ من التاسعہ مات سنہ ۲۹۸ (تقریب ص۴۲۶) ثقہ راوی حدیث ہیں۔ رجالِ صحیح میں سے ہیں (فتح الباری پ۱۳ ص۲۷۸)۔

۳- مستلم بن سعید :-

امام احمد اور ابنِ حبان انھیں ثقہ قرار دیتے ہیں (فتح) صدوق (تقریب ص۳۳۶)

یعنی ثقہ اور سچے راویِ حدیث ہیں۔

۴ - حجاج بن الاسود الاسود :-

یہ ابن ابی زیاد بصری ہے - اس نے ثابت بُنانی، جابر بن یزید، ابی نضرہ اور کئی دُوسرے بزرگوں سے احادیث روایت کی ہیں اور اس سے جریر بن حازم، حماد بن سلمہ، روح بن عبادہ اور کئی اور لوگوں نے روایات لیں - حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

قال احمد ثقة و رجل صالح وقال ابن معین ثقة و قال ابو حاتم صالح الحديث وذكره ابن حبان فی الثقات - (لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۱۷۵ فتح الباری کتاب ۲ ص ۲۷۸)	امام احمد نے فرمایا حجاج ثقہ راوی ہے اور مردِ صالح ہے - امام یحییٰ بن معینؒ لکھتے ہیں وہ ثقہ ہے - ابو حاتم کہتے ہیں، وہ صالح الحدیث ہے اور ابن حبانؒ نے اُسے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے -

کشف الستارة عن وجه النكارة

حافظ ذہبیؒ کا خیال ہے کہ حجاج نکارت کا مرتکب ہے - یعنی ثابت بُنانی سے روایت کرنے میں وہ ثابت کے دُوسرے شاگردوں کی مخالفت کر رہا ہے - پس "منکر الروایۃ" ہے، فرماتے ہیں :-

فاتی بخبر منکر عنه عن انس رضی فی ان الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون رواه البیھقی - (میزان)	حجاج اسود ثابت سے حضرت انس رضی کی روایت لایا ہے، جو منکر ہے، یعنی حجاج ثابت کے دُوسرے شاگردوں کی مخالفت کر رہا ہے -

ہم نے بہت تلاش کی کہ ثابت بنانی کے دُوسرے شاگردوں سے اس روایت کی کہیں مخالفت مل جائے، یعنی اُنھوں نے اسے اس طرح روایت کیا ہو کہ

حیاتِ انبیاؑ کا یہ مضمون اس سے ٹکرا رہا ہوا اور کسی طرح اس پر ثقہ کی زیادتی بھی نہ بن سکے؛ لیکن افسوس کہ حافظ ذہبیؒ کے اس گمان کی ہمیں کہیں سے تصدیق میسّر نہیں آسکی۔ من ادعی فعلیہ البیان۔

غایت تامّل سے ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ ممکن ہے حافظ ذہبیؒ کے پیشِ نظر حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے قبر میں نماز پڑھنے کی وہ روایت ہو جسے کہ ہم صحیح مسلم کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں، اس لیے کہ اس روایت کا سلسلۂ اسناد بھی عن ثابت البنانی عن انسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ــــــ پر منتہی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ صلوٰۃ موسیٰ فی القبر والی روایت کا سلسلۂ اسناد یہ ہے:-

حماد بن سلمہ عن ثابت عن انسؓ عن النبیؐ۔

اور صلوٰۃ جمیع الانبیاء فی القبور والی روایت کا سلسلۂ اسناد یہ ہے:-

حجاج بن الاسود عن ثابت عن انسؓ عن النبیؐ۔

حافظ ذہبیؒ کے اعتراض سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں روایتوں کو اصلاً ایک سمجھ رہے ہیں، اور اس لیے کہ حماد بن سلمہ حضرت ثابت سے صرف موسیٰؑ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا روایت کر رہے ہیں اور حجاج اسود اس کی بجائے تمام انبیائے کرام کا اپنی اپنی قبروں میں نماز پڑھنا نقل کر رہے ہیں، انھوں نے اسے ثابتؓ کے دوسرے شاگردوں کی مخالفت سمجھ کر حجاج اسود کو نکارت کا مرتکب قرار دے دیا اور حدیث کو "منکر" کہہ دیا۔

حالانکہ

یہ دونوں حدیثیں علیحدہ علیحدہ تھیں۔ پس نکارت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

نہ یہ ایک روایت ہے اور نہ حجاج اپنے شیخِ روایت کے دُوسرے شاگردوں سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ حدیثیں دو ہیں اور مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "لسان المیزان" میں حافظ ذہبیؒ کی مذکورہ جرح بالکل قبول نہیں کی اور اسے نقل کر کے اس کا رد فرمایا ہے۔ حضرت امام احمدؒ اور امام یحییٰ بن معینؒ جیسے ائمۂ جرح و تعدیل جس کے ثقہ ہونے پر نص فرما رہے ہوں، اس کی روایت کیسے نشانۂ ضعف بن سکتی ہے۔ فتفکروا یا اولی الابصار!

الغرض حجاجِ اسود نہایت ثقہ اور صالح الحدیث ہے اور ائمۂ کبار نے اس کے ثقہ ہونے پر نص فرمائی ہے۔ حافظ ذہبیؒ کا منشاءِ اعتراض یہ تھا کہ دونوں روایتیں ایک ہوں، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ دونوں حدیثیں جُدا جُدا ہیں اور اپنے اپنے مقام پر دونوں صحیح ہیں۔ رجال دونوں کے ثقہ ہیں اور سب میں اتصال موجود ہے۔ حدیثِ صلوٰۃِ موسیٰ فی القبر کو محدّثین نے اس حدیث "الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون" کا شاہد اور مؤیّد قرار دیا ہے۔ پس دونوں کو ایک حدیث کیسے سمجھا جا سکتا ہے! شیخ الاسلام حضرت علّامہ عثمانیؒ نقل فرماتے ہیں:۔

وشاھد ھذا الحدیث ما ثبت فی صحیح مسلم من روایۃ حماد بن سلمۃ۔ (فتح الملہم جلد ۱ ص ۳۲۹)

صحیح مُسلم میں حماد بن سلمہ سے جو روایت منقول ہے، وہ اس حدیث (الانبیاءُ احیاءٌ فی قبورھم یصلّون) کی شاہد ہے۔

ھذا ما ظھر لی واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم!

المبحث الثانی

حضرت ثابت بُنانیؓ سے یہ حدیثِ حیاتِ انبیاءؑ صرف حجاجِ اسود روایت کر رہے ہیں۔ راوی ثقہ ہونے کے باعث یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اس

کی سند بالکل بے غبار ہے؛ تاہم تائید مزید ملاحظہ کیجیے:۔

حضرت ثابت بُنانی رحؒ یہ دُعا کرتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ اَعْطَیْتَ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَنْ یُّصَلِّیَ لَكَ فِیْ قَبْرِہٖ فَاَعْطِنِیْ ذٰلِكَ۔

(حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد ۲ ص ۳۱۹ مصر)

اے اللہ! اگر تو نے (انبیاءؑ کے سوا) کسی کو اپنی مخلوق میں سے یہ مرتبہ دیا ہے کہ وہ اپنی قبر میں تیرے لیے نماز پڑھے تو وہ مرتبہ مجھے عطا فرما!

دُوسری سند میں یُوسف بن عطیہ متابعت کرتے ہُوئے کہتے ہیں:۔

سمعت ثابتًا یقول لحمید الطویل هل بلغك یا ابا عبید ان احدًا یصلی فی قبرہ الا الانبیاء قال "لا" قال ثابت "اَللّٰھُمَّ اِنْ اَذِنْتَ لِاَحَدٍ اَنْ یُّصَلِّیَ فِیْ قَبْرِہٖ فَاْذَنْ لِثَابِتٍ اَنْ یُّصَلِّیَ فِیْ قَبْرِہٖ۔

(حلیۃ الاولیاء جلد ۲ ص ۳۱۹ مطبوعہ مصر)

اِن روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انبیائے کرامؑ کے اپنی اپنی قبُورِ شریفہ میں نماز پڑھنے کا مضمون حضرت ثابت بنانی رضؓ کے نزدیک یقینی طور پر ثابت تھا، تبھی تو وُہ اپنے لیے بھی اس کی دُعائیں کر رہے تھے، پھر ان کا ابُو عبیدہؓ سے یہ کہنا کہ کیا تمھیں کوئی روایت پہنچی ہے کہ انبیائے کرامؑ کے سوا کچھ اور لوگ بھی اپنی قبروں میں نمازیں پڑھیں گے اور انبیائے کرامؑ سے متعلق اس دعوے پر ابُو عبیدہؓ کا نکیر نہ کرنا اس حقیقتِ حال کا پتہ دیتا ہے کہ حضرت ابُو عبیدہؓ کو بھی یہ مضمونِ حدیث پہنچ چکا تھا کہ انبیائے کرامؑ اپنی اپنی قبورِ شریفہ میں نمازیں پڑھتے ہیں، ورنہ غیر انبیا کے اس مقام پر آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

اب حجاج اسودؒ حضرت ثابتؓ سے یہ مضمون نقل کرنے میں متفرد نہ رہے اور اس کے ایک اور طریق کا پتہ چل گیا۔ اگرچہ اس میں ابوعبیدہؓ عن ثابتؓ عن انسؓ

کی تصریح نہیں ؛ تاہم اس کا مجموعی مفاد اس روایت کی تائید ضرور کر رہا ہے اور حضرت ثابت رض کے نزدیک تو اس مضمون کے ثابت ہونے میں کوئی شبہ ہی نہ رہا۔

حضرت جبیر رض کہتے ہیں کہ میں نے ثابت بنانی رح کو خود قبر میں اُتارا تھا۔ حمید طویل بھی اُس وقت میرے ساتھ تھے۔ جب ہم نے ان پر اینٹیں برابر کر دیں تو ایک اینٹ گر پڑی۔ ثابت رض کو دیکھا کہ قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔

(والتفصیل فی تنویر الملک فی رویۃ النبی والملک صـ۲۳ مصر)

فلما سوينا عليه اللبن سقطت لبنة فاذا انا به يصلى فى قبره فقلت للذى معى الا ترى قال اسكت فلما سوينا عليه و فرغنا اتينا ابنته فقلنا لها ما كان عمل ابيك ثابت رض ..... قال فى دعائه اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ اَعْطَيْتَ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ الصَّلٰوةَ فِى الْقَبْرِ فَاَعْطِنِيْهَا۔ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد ۲ صـ۳۱۹ مصر)

وقال ابن سعد فى الطبقات وابن ابى شيبة فى المصنف و الامام احمد فى الزهد اخبرنا عفان بن مسلم قال حدثنا حماد بن سلمة عن ثابت البنانى هكذا والله اعلم بالصواب!

المبحث الثالث

کن کن اکابر محدثین رح اور اعیانِ اُمت نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر نص فرمائی ہے اور اسے تسلیم کیا ہے :-

(۱) حافظ بیہقی رح۔ (۲) حافظ ہیثمی رح۔ (۳) حافظ ابنِ حجر عسقلانی رح۔

(۴) علامہ عزیزی رح شارح جامع صغیر۔ (۵) امام حدیث و فقہ مُلّا علی قاری رح۔

(۶) شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح۔ (۷) حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سرہندی رح۔

(٨) حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۔ (٩) امام سیوطیؒ ۔ (١٠) قاضی شوکانیؒ ۔
(١١) رئیس المحدثین حضرت امام مولانا انور شاہؒ ۔ (١٢) شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ۔
(١٣) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (١٤) حضرت علامہ شعرانیؒ
وغیرہم من الاکابر والاعیان ۔ رحمہم اللہ ۔

حوالجات از بعض عبارات

١ ۔ ھو حدیث صحیح (عزیزی شرح جامع صغیر جلد ٢ ص ١٣٤ مصر) ۔

٢ ۔ خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ :-

اخرجہ من طریق یحیی بن ابی بکر وھو من رجال الصحیح عن المستلم بن سعید وقد وثقہ احمد وابن حبّان عن الحجاج الاسود وھو ابن ابی زیاد البصری وقد وثقہ احمدؒ وابن معینؒ عن ثابتؓ عن انسؓ واخرجہ ایضاً ابو یعلیؒ فی مسندہ من ھذا الوجہ واخرجہ البزّار لکن وقع عندہ عن الحجاج الصواف وھو وھم والصواب الحجاج الاسودؓ کما وقع التصریح فی روایۃ البیہقیؒ وصححہ البیہقیؒ ۔
(فتح الباری پ ١٣ ص ٢٧٨ کتاب الانبیاء)

یہ حدیث یحیی بن ابی بکر کے طریق سے مروی ہے اور وہ صحیحین کے راویوں میں سے ہے اُس نے مستلم بن سعید سے روایت کی ہے جسے کہ امام احمدؒ اور ابن حبانؒ نے ثقہ قرار دیا ہے ۔ اُس نے یہ روایت حضرتِ ثابتؓ سے لی ہے اور انھوں نے اسے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے ۔ ابو یعلیؒ نے بھی اپنی مسند میں اسے اسی طریق سے روایت کیا ہے ۔ بزّار کی تخریج میں وہم سے حجاج صوّاف آگیا ہے ۔ صحیح حجاجِ اسودؓ ہی ہے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے تصریح کی ہے اور امام بیہقیؒ نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے ۔

۳۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی اس حدیث کی تصحیح اسی طرح فرمائی ہے اور تمام مرکزی راویوں کی توثیق کرتے ہوئے اس حدیث سے احتجاج فرمایا ہے اور حافظ عسقلانیؒ کی تائید کی ہے۔ (فتح الملہم جلد ا صـ ۳۲۹)

۴۔ امام ملا علی قاریؒ علیہ رحمۃ ربہ الباری :۔

صح خبر الانبیاء احیاء فی قبورہم (مرقاۃ جلد ۲ صـ ۲۱۲ مصر)۔

انبیاء کرامؑ اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

۵۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ :۔

ابو یعلیؒ منقلی ثقات از روایت انس بن مالکؓ آوردہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ صـ ۵۱۹ عمدۃ المطابع ۱۲۷۱ھ۔ جذب القلوب صـ ۱۸۰)۔

۶۔ حضرت امام ربانی سیدنا مجدد الف ثانیؒ :۔

برزخ صغریٰ چوں از یک وجہ از مواطن دنیوی است گنجائش ترقی دارد و احوال ایں موطن نظر بأشخاص متفاوت و متفاوت فاحش دارد "الانبیاء یصلون فی القبور" شنیدہ باشند (مکتوبات دفتر ۲، ۹۶ صـ ۲۹)

برزخ صغریٰ ایک جہت سے موطن دنیوی بھی کہلا سکتا ہے اور اس اعتبار سے اس برزخی حالت میں بھی ترقی کی گنجائش ہے۔ اس موطن کے حالات مختلف لوگوں کے حالات کے مناسب مختلف ہوتے ہیں۔ "انبیاء اپنی قبروں میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں" یہ حدیث آپ نے سنی ہی ہوگی (یعنی برزخی زندگی کے ان اعمال میں بھی ترقی کی گنجائش ہے اور اس ایک جہت سے اسے موطن دنیوی بھی سمجھا

لے جو لوگ برزخی اور دنیاوی معاملات کو کسی جہت سے بھی جمع ہونا محال سمجھتے ہیں۔ حضرت مجددؒ کا یہ ارشاد ان کی فکر و نظر پر ایک تازیانۂ عبرت ہے۔

جا سکتا ہے۔

۷۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (فیوض الحرمین ص۲۸ مطبوعہ دیوبند)

۸۔ قاضی شوکانیؒ:۔

قد ثبت فی الحدیث ان الانبیاء احیاء فی قبورھم رواہ المنذری۔ (نیل الاوطار جلد ۳ ص۲۱۱)

حدیث میں ثابت ہو چکا ہے کہ انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ رہتے ہیں۔

۹۔ امام سیوطیؒ نے اس کے تواتر کا دعوے کیا ہے۔ یہ تواتر غالباً تواتر قدر مشترک کے درجے میں ہے۔ لکھتے ہیں:۔

تواترت بھا الاخبار (مرقاۃ الصعود) حیاۃ النبی ﷺ فی قبرہ وسائر الانبیاء معلومۃ عندنا علماً قطعیاً لما قام عندنا من الادلۃ فی ذالک وتواترت بہ الاخبار۔

حیات النبی کے ثبوت میں متواتر روایات موجود ہیں۔ حضورؐ اور باقی سب انبیاءؑ کا اپنی اپنی قبور میں زندہ ہونا ہمارے نزدیک قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے۔ اس پر دلائل قائم ہو چکے ہیں اور احادیث تواتر کے درجہ پر پہنچ چکی ہیں۔

(فتاوی حافظ سیوطیؒ جلد ۲ ص۱۴۷ مصر)

۱۰۔ ان من جملۃ ما تواتر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیاۃ الانبیاء فی قبورھم۔

(النظم المتناثر من الحدیث المتواتر کما فی شرح العلامۃ البوسنوی ص۵۵ مصر)۔

تلک عشرۃ کاملۃ۔

اِس حدیث کی صحت پر اکابرِ دیوبند کا فیصلہ

۱۔ رئیس المحدثین حضرت علامہ انور شاہؒ :۔

فی البیہقی عن انسؓ و صححہ ووافقہ الحافظ فی المجلد السادس ان الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔ (فیض الباری جلد ۲ صفحہ ۴۳۴ مصر)

۲۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ :۔

حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ انبیا علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ (نشر الطیب ص ۱۵۴ مطبوعہ دیوبند)۔

المبحث الرّابع

الکلام علیٰ معنی الحدیث

اِس حدیث میں یہ بات غور طلب ہے کہ اِس کا منشا انبیاءؑ کی کیا صرف حیاتِ طبعی کا بیان ہے یا جس قسم کی حیات انبیائے کرامؑ کے لیے ثابت کی جا رہی ہے وہ اس حیاتِ طبعی پر ایک امرِ زائد ہے؟ تو اس کے لیے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیے :۔

عام طور پر رُوح اور جسم کے تعلق یا رُوح کے بدن میں رہنے کو زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہ حیات کا صرف طبعی مفہوم ہے۔ اِس حیاتِ طبعی کی پھر دو حالتیں ہیں؛ ایک یہ کہ یہ حیات ان تمام کاموں سے جو مقصدِ حیات ہیں، خالی اور بے کار ہو اور دُوسرے یہ کہ یہ حیات بے کار نہ ہو اور ان جیسے کاموں سے جو مقصدِ حیات ہیں، اس کا تعطّل نہ ہو۔

اوّل الذکر حیاتِ طبعی تو ہے لیکن حقیقۃً یہ بھی موت ہے یا ایک ایسی زندگی

ہے کہ اس میں اور موت میں کوئی فرق نہیں۔ قرآنِ عزیز ان لوگوں کو، جن کی حیات طبعی تو تھی، لیکن ان کا دامنِ حیات مقصدِ حیات سے بالکل خالی تھا، قلوب اُن کے مُردہ تھے اور دِل کے کان بہرے ہو چکے تھے، صریح الفاظ میں مُردے قرار دیتا ہے:۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ۔ بے شک آپ ان مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہیں!

(پ۲۰ نمل ع۱پ ۲۱ روم)

پھر یہی نہیں کہ انہیں "مُردے" فرمایا، بلکہ ان کے لیے مُردوں کے لوازمات بھی ذکر کر دیے:۔

وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ ۔ اور آپ ان کو نہیں سُنا سکتے، جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

(پ۲۲ فاطر)

یہ لوگ طبعی طور پر تو زندہ اور موجود تھے، لیکن حکمی طور پر مُردہ ـــــ بظاہر حیات تھی لیکن حقیقۃً موت ـــــ

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل،
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے!

قرآنِ عزیز احکامِ طبعی کو اپنا موضوع قرار نہیں دیتا، بلکہ حقائق کا ادراک کرتا ہے۔ اس کی نظر میں اندھاپن ظاہری آنکھوں سے محرومی نہیں، باطن کی سیاہی اور دِل کی آنکھوں پر پردے کا نام ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ :۔

لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۔ یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ حقیقت میں اندھے دل ہوتے ہیں جو سینوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

(پ۱۷ حج)

اور اسی وجہ سے فرمایا :۔

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ أَعْمٰى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمٰى۔ (پ ۱۵) جو کوئی اس جہان میں اندھا ہا سو وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ رُوح و جسم کا تعلق یا رُوح کا بدن میں ہونا ایک حیات طبعی ہے۔ جب تک اس کا اشتغال ان کاموں میں نہ ہو، جو مقصدِ حیات اور رازِ تخلیق کائنات ہیں، اسے حقیقی حیات نہیں کہا جا سکتا۔ اربابِ خبرت اس طبعی زندگی کی اوّل الذکر کیفیت کو موت ہی قرار دیتے ہیں اور صرف ثانی الذکر زندگی ہی کو حیات کہتے ہیں۔

یہاں تین کیفیتیں اور اُن کے احکام پیشِ نظر رکھیے:۔

۱۔ رُوح اور جسم کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اسے عامۃ النّاس اور ارباب خبرت دونوں موت قرار دیتے ہیں، یہ حیات کسی معنی میں نہیں۔

۲۔ رُوح اور جسم کا تعلق تو ہو، لیکن دامنِ حیات مقصدِ حیات سے خالی ہو، اسے عوام حیات اور اربابِ خبرت موت سے تعبیر کرتے ہیں۔

۳۔ رُوح اور جسم کا تعلق بھی ہو اور زندگی بھی مقصدِ حیات سے خالی نہ ہو، اربابِ خبرت اسے ہی حیات قرار دیتے ہیں اور حقیقت میں زندگی یہی ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ارشاد فرمایا کہ "الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون" (انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں)، تو آپ کا منشا صرف حیاتِ طبعی کا بیان نہیں، بلکہ اس حیات کی کیفیت کا اظہار تھا۔ اگر حیاتِ انبیاء کا یہی مفہوم ہو کہ انھیں قبورِ شریفہ یا ریاضِ منورہ میں ایسی زندگی حاصل ہے، جس میں محض رُوح و بدن کا تعلق قائم ہے، تو یہ کوئی خاص مقام نہیں۔ اس لیے کہ قرآن عزیز تعطل عن الافعال کی حیاتِ طبعی کو بے کار ہونے کی وجہ سے موت کے برابر قرار دیتا ہے۔ پس حدیث شریف کا منشا اسی قسم کی حیاتِ طبعی نہیں، بلکہ ایسی حقیقی حیات

ہے جس میں محض روح و بدن ہی کا تعلق نہیں، بلکہ اعمال سے بھی ہرگز تعطّل نہیں اور یہی حقیقت میں قرآن کا مفہومِ حیات ہے۔

الغرض یہ مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں سے دوسری قسم کی حیات نہیں، بلکہ تیسری قسم کی حقیقی حیات ہے، اور اسے ہی اربابِ دانش حقیقتِ حیات قرار دیتے ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہی ارشاد فرماتے کہ "الانبیاء احیاء فی قبورھم" تو یوں متبادر ہو سکتا تھا کہ روضۂ شریفہ میں آپ صرف روح و بدن کے تعلق کے ساتھ زندہ ہیں اور آپ کی حیاتِ جسمانی فقط اس تعلق کا نام ہے، لیکن حضورؐ نے لفظ "یصلون" ارشاد فرما کر "احیاء" کی کیفیتِ حیات پر بھی متنبہ کر دیا، یعنی آپ جسدِ عنصری سے اس طرح فائز الحیات ہیں کہ زندوں جیسے کاموں سے ہرگز تعطّل نہیں ہوا اور آپ بدستور اعمالِ طیبات میں مشغول ہیں۔ نہ دنیا میں ان کے اشغالِ طیبہ میں تعطّل ہوا، نہ قبورِ شریفہ میں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ انبیاءِ کرامؑ کی اس حیاتِ قبریہ کے دو جزو ہیں:-

۱- وہاں کی حیات محض روحانی نہیں کہ صرف ارواح زندہ ہوں، بلکہ یہ زندگی جسم و روح کے مجموعہ کی ہے۔

۲- یہ حیات صرف حیاتِ طبعی کی حدود تک نہیں، بلکہ ان اشخاصِ کریمہ کا زندوں جیسے کاموں میں اشتغال بھی موجود ہے۔

رئیس المحدثین حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ نے ان دونوں جزوں کو خوب بیان فرمایا ہے۔ جزوِ اوّل کے متعلق لکھتے ہیں:-

یرید بقوله "الانبیاء احیاء" مجموع الاشخاص، لا الارواح فقط (عقیدۃ الاسلام ص۳۶)

آں حضرتؐ کی مراد اس حدیث سے کہ "انبیاءِ کرامؑ زندہ ہوتے ہیں" یہی تھی کہ مجموعہ اشخاص فائز الحیات ہیں، نہ کہ فقط

ان کی ارواح زندہ ہیں۔

اور دوسرے جزو کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اراد بالحیٰوۃ فعل الاعمال واکثر من فی القبور فی الصلاۃ بخلاف المقربین ومعانی الحیات فی النہایۃ وان المیت لا فعل لہ فی خلق افعال العباد والاحادیث ارادت افعال الحیٰوۃ واعمالہا لا بقاء الروح وھو قولہ ؑ فنبی اللہ حی یرزق واحیاء فی قبورھم یصلون تسرد فی ذکر الحیٰوۃ افعالہا لا اصلہا او اراد مع الاجساد فان اجسادھم حرمت علی الارض۔ (عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام مصنفہ مولینا السید انور شاہ ؒ ص۳۶)

(خلاصہ) آں حضرتؐ کی مراد انبیاؑ کے زندہ ہونے سے اعمال کی زندگی ہے اور اکثر لوگوں کی قبریں ایسے اعمال سے معطل ہیں ہیں۔ ان احادیث کا منشا اعمالِ حیات کا بیان ہے نہ کہ فقط روح کی زندگی۔ حضورؐ کا یہ ارشاد فنبی اللہ حی یرزق (اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی ملتا ہے) اور یہ ارشاد کہ انبیائے کرامؑ اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ یہ سب اصلِ حیات کے بیان میں نہیں، بلکہ (اس سے بھی زائد) اعمالِ حیات کے ثابت ہونے کے لیے ارشاد فرمائے گئے تھے یا یوں کہہ لیجیے کہ اس زندگی سے مراد حیاتِ جسدی کا بیان ہے، کیونکہ انبیاؑ کے اجسادِ کریمہ مٹی پر حرام کر دیے گئے ہیں اور وہ اعمال انہی اجسادِ کریمہ کے ساتھ وجود میں آرہے ہیں۔

شاہ صاحب ؒ نے اس دوسرے جزو کو درسِ بخاری میں بھی تفصیلاً ارشاد فرمایا تھا، چونکہ وہاں پہلے جزو کی اس طرح تفصیل نہیں، اس لیے عبارت سے ابتدائی سطح میں مغالطہ لگ سکتا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ پہلا جزو محققین سلف کے

نزدیک اتنا بدیہی تھا کہ اس کے لیے کسی تفصیل کی ضرورت محسوس نہ فرماتے تھے۔ ان لوگوں کے علم و فہم پر حیرت ہوتی ہے، جو اس جزوِ اول کے عدمِ ذکر کو ذکرِ عدم بنا کر دوسرے جزو کا مفہوم و مطلب بھی اپنی تدلیس کی نذر کر دیتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منہا ومن تحریف المبطلین۔

۱۔ مولانا السید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

المراد بحدیث الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون انھم ابقوا علی ھذہ الحالۃ ولم تسلب عنھم۔ (تحیۃ الاسلام ص۳۶)	اس حدیثِ حیاتِ انبیاءؑ کا مطلب یہی ہے کہ انبیائے کرامؑ (بدن میں رُوح لوٹ آنے کی) اسی حالت میں باقی رکھے گئے ہیں اور پھر رُوح ان سے جدا نہیں کی گئی۔

۲۔ قاضی شوکانیؒ شرحِ حصنِ حصین میں فرماتے ہیں:۔

انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ وروحہ لا تفارقہ لما صح ان الانبیاء احیاءٌ فی قبورھم۔ (تحفۃ الذاکرین للشوکانی ص۲۸)	حضورِ اکرمؐ اپنی قبرِ شریف میں زندہ ہیں اور آپؐ کی رُوحِ اقدس آپؐ کے جسدِ اطہر سے کبھی جُدا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ حدیثِ صحیح سند سے ثابت ہو چکی ہے کہ انبیاءؑ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں

البیان المسدد من حضرت المجددؒ

۳۔ حضرت امامِ ربانی مجددِ الفِ ثانیؒ نے اس حدیث کو اس سیاق و سباق کے ساتھ نقل فرمایا ہے:۔

"برزخِ صغریٰ چوں از یک وجہ از مواطنِ دُنیوی است، گنجائشِ ترقی دارد

واحوالِ اہلِ وطن نظر باشخاص متفاوتہ تفاوت فاحش دارد۔ الانبیاءُ یصلّون فی القبور شنیدہ باشند و حضرت پیغمبر ما علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام شبِ معراج چوں بہ قبر حضرت کلیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام گزشتند دیدند کہ در قبر نماز می گزارد۔

(مکتوبات جلد ۲ صہ ۲۹/۳ ء ۱۹ مطبوعہ لکھنؤ)

اس کلامِ ہدایت نظام میں جہاں اس طرف اشارہ ہے کہ حیاتِ برزخی کسی ایک جہت سے حیاتِ دُنیوی بھی ہے، وہاں اس امر کی تصریح بھی موجود ہے کہ برزخِ صُغریٰ میں بھی ترقّیِ مقامات کی گنجائش ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس ترقّی سے کیا مُراد ہے؟ جواباً عرض ہے کہ اس سے مُراد "قربِ الٰہی" میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔

اس ارتقاء کا تحقّق کیسے ہوتا ہے اور اس ترقّی کی کیا صُورت ہوتی ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے حضرت مجدّدِ الف ثانی رح کے اُصُول و ضوابط پیشِ نظر رکھیں:۔

حضرت کے نزدیک "عالمِ خلق" "عالمِ امر" سے افضل ہے اور وہ "قربِ عالمِ خلق" کو "قربِ اصلی" اور "قربِ عالمِ امر" کو "قربِ ظلّی" قرار دیتے ہیں۔

پس ان کے کلام میں ترقّی کی صُورت اور ارتقاء کا انداز یہی ہے کہ یا "قربِ ظلّی" سے "قربِ اصلی" میں انتقال ہو اور یا "قربِ اصلی" ہی میں قوّت و زیادت ہوتی چلی آئے۔

اسلام میں ایمان کے بعد نماز کا درجہ ہے اور اس کے کمالاتِ ایمان کی طرح ذاتی کمالات ہیں۔ اس عبادت کو اسلام میں جو مرتبہ حاصل ہے۔ اس کے پیشِ نظر اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ قُرب جو نماز میں تحقّق پذیر ہوگا۔ اس قرب سے بہرحال اعلیٰ و افضل ہے، جو کسی اور حالت میں حاصل ہوگا۔ پس نماز کے ساتھ "قربِ الٰہی" میں بڑھتے چلے جانا "قربِ اصلی" پر فائز المرام ہونا

ہے۔ اسی لیے فرمایا :۔

الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون۔ انبیاے کرامؑ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

پس جب یہ نمازیں جو انبیاے کرامؑ اپنے اپنے روضات میں تلذذاً عمل میں لا رہے ہیں، قربِ الٰہی میں سامان اور نفلہ ہیں، جیسا کہ حضرت مجدد صاحبؒ نے تصریح فرمائی ہے اور یہ بھی حقیقت مسلمہ ہے کہ قرب کے باب عالم خلق عالم امر سے افضل ہے۔ تو اس بنیادِ یقین سے چارہ نہیں کر

انبیاے کرامؑ کا اپنی اپنی قبروں میں نمازیں پڑھنا جب قربِ الٰہی میں ترقی پانے کی گنجائش رکھتا ہے، تو ان کا یہ عمل ضرور عالم خلق ہی سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ حضرت مجددؒ قربِ عالم خلق ہی کو قربِ اصلی قرار دیتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے عملِ صلوٰۃ کا عالمِ خلق سے متعلق ہونا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اجسادِ کریمہ کے ساتھ فائز الحیات ہوں اور یہ اداے نماز انہی اجسامِ عنصریہ سے عمل میں آ رہا ہو۔ اگر یہ عملِ صلوٰۃ صرف روح ہی کا عمل ہو تو پھر یہ عالمِ امر سے متعلق ہوگا اور واضح ہے کہ حضرت مجددؒ کے کلام میں اسے قربِ اصلی کہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

پس خلاصۂ کلام یہی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک اس حدیثِ حیاتِ انبیاؑ کا مفہوم و مطلب یہی ہے کہ انبیاے کرامؑ اپنی اپنی قبروں میں اجسادِ عنصریہ سے فائز الحیات ہیں۔

۴۔ علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں :۔

الصلوٰۃ تستدعی جسداً حیاً۔ (حاشیہ سنن نسائیؒ)

۵۔ حضرت علامہ شعرانیؒ فرماتے ہیں :۔

قد صحت الاحادیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ یصلی باذان واقامۃ۔

(منح المنۃ ص۹۲ مصر)

صحیح حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ حضورِ انورؐ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور اذان واقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔

۶۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ :-

ان حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القبر لا یعقبہا موت بل یستمر حیًّا والانبیاء احیاء فی قبورہم۔

(فتح الباری ص۲۲/۷ مصر)

آں حضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں اس طرح زندہ ہیں کہ اس زندگی پر موت پھر کبھی نہ آئے گی۔ آپؐ ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں گے اور انبیائے کرامؑ اپنی قبروں میں زندہ ہی ہوتے ہیں۔

المبحث الخامس

الکلام علیٰ عالم المثال

حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ فتوحاتِ مکیہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے کئی اور آدم گزرے ہیں اور اس پر انھوں نے عالمِ مثال کے کچھ مشاہدات ذکر کیے ہیں۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب آدم عالمِ مثال کے ہیں، عالمِ شہادت میں صرف وہی ایک آدمؑ گزرے ہیں جنھوں نے صفتِ حیاتِ معتنہ پر خلقت پائی۔ ان کے آنے سے پہلے ان کے لطائف یا صفات میں سے کوئی صفت یا لطیفہ اللہ رب العزت کی ایجاد سے عالمِ مثال میں وجود پاتا رہا اور

صورتِ آدم میں اس کا ظہور ہوتا رہا۔

(دیکھیے مکتوباتِ شریف دفتر ۲ ع ۵۸ ص ۱۱۳)

حضرت امام ربانی شیخ سرہندیؒ کے اس ارشاد سے بعض حضرات یہ مطلب نکال رہے ہیں کہ جس طرح ارواحِ مختلفہ عالمِ مثال میں موجود ہیں، اسی طرح انبیائے کرامؑ وفات کے بعد عالمِ مثال میں چلے جاتے ہیں اور ان کی ارواحِ قدسیہ عالمِ مثال ہی میں مختلف اطوار میں ظہور فرماتی ہیں۔ یہ انبیائے کرامؑ کا اپنی قبور میں نمازیں پڑھنا سب مثالی وجود ہی سے عمل میں آتا ہے نہ کہ جسدِ عنصری سے نعیم قبر اور عذابِ قبر اسی عالمِ مثال میں ہوتے ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ پہلے حضرتِ مجددؒ کے کلام میں عالمِ مثال کا معنی سمجھ لیجیے آپؒ کے ہاں عالمِ مثال ایک آئینہ کے درجہ میں ہے جس میں حقائق و معانی منعکس ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی کوئی صورت و ہیئت نہیں، جتنی صورتیں اور شکلیں اس میں نظر آتی ہیں، وہ دوسرے عوالم سے اس آئینۂ مثال میں عکس رہی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھر یہ عالمِ مثال کوئی رہنے کا محل نہیں، یہ عالمِ ارواح اور عالمِ اجساد کے درمیان فقط ایک برزخ کا درجہ حاصل ہے، جو فی حدِ ذاتہٖ کسی صورت و شکل کو متضمن نہیں۔

عالمِ مثال کی اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ روحِ آدمؑ خلقتِ آدمؑ سے پیشتر بھی ہرگز عالمِ مثال میں اقامت گزیں نہ تھی۔ قرونِ متطاولۂ سابقہ میں فقط اس کے لطائف منعکس ہو کر آدمؑ کا نام پاتے رہے۔ روح بہرحال عالمِ ارواح میں تھی نہ کہ عالمِ مثال میں۔ اس لیے کہ عالمِ مثال رہنے کی جگہ نہیں فقط دیکھا جانے کا ایک آئینہ ہے جس میں حقائق و معانی اترتے ہیں۔

پس یہ کہنا کہ جس طرح ارواحِ مختلفہ عالمِ مثال میں موجود رہے ہیں، اسی

طرح انبیاے کرامؑ بعدِ وفات اِس عالمِ مثال میں چلے جاتے ہیں، کس طرح بناے فاسد علی الفاسد ہے ۔ اعاذنا اللہ منہا!

ارشادِ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ

نوشتہ بودند کہ روح پیش
از تعلق بہ بدن در عالمِ مثالی بودہ
است و بعد از مفارقت از بدن
باز بعالمِ مثالی خواہد رفت،
پس عذابِ قبر در عالمِ مثالی خواہد
بود ..... بداند کہ ایں قسم خیالات
از صدق قلیل النصیب است ...
..... بعالمِ مثال کار ندارد نہ پیش
از تعلق و نہ بعد از تعلق بیش ازیں
نیست کہ در بعضے اوقات بتوفیقِ
اللہ سبحانہ، بعضے از احوالِ خود را
در مرآۃ عالم مثال می نماید۔
...... عالمِ مثال از برائے
دیدن است نہ برائے بودن جائے
بودن عالمِ ارواح است یا عالمِ
اجساد، عالمِ مثال بیش از مرآۃ
ایں دو عالم نیست .....

آپ نے لکھا تھا کہ روح بدن کے ساتھ
وابستہ ہونے سے پہلے عالمِ مثال میں
رہی ہے اور بدن سے جدا ہونے کے
بعد پھر عالمِ مثال میں چلی جاتی ہے۔
پس عذابِ قبر اس عالمِ مثال میں ہوتا
ہے۔ جواباً آپ کو جاننا چاہیے کہ اس
قسم کے خیالات انھی لوگوں کے ہیں،
جنھیں صداقت بہت کم نصیب ہوئی
ہے اور وہ اس باب میں قلیل النصیب
ہیں۔ روح کا عالمِ مثال سے کوئی سروکار
نہیں، نہ بدن کے ساتھ وابستہ ہونے
سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ زیادہ سے
زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ رب العزت
کی قدرت سے روح کے بعض احوال
اس عالم کے آئینے میں منعکس ہوتے
ہوں لیکن عالمِ مثال روح کے رہنے
کی جگہ نہیں وہ تو محض دیکھنے کا ایک

"عذابِ قبر ازیں قبیل نیست، کہ حقیقتِ عقوبت است نہ صورت وشبہِ عقوبت"۔

(مکتوبات دفتر ۳، م۱۷، ص۵۸ لکھنؤ)

پردہ ہے جس پر صورتیں ظاہر ہوتی ہیں)۔ رہنے کی جگہ یا عالمِ ارواح ہے یا عالمِ اجساد۔ عالمِ مثال اِن دونوں جہانوں کے آئینہ ہونے کے سوا اور کچھ نہیں۔ عذابِ قبر اس مثالی صورت پر وارد نہیں ہوتا، کیونکہ عذابِ قبر خود ایک حقیقت ہے۔ کسی عذاب اور سزا کی محض کوئی تصویر نہیں"۔

اِس مکتوب میں حضرت امامِ ربانیؒ نے جو تصریحات فرمائیں، ان کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:۔

۱۔ معاملاتِ قبر اپنا حقیقی وجود رکھتے ہیں، فقط صورت درانعکاس نہیں۔

۲۔ وجود عالمِ مثال فقط شبح وصورت ہے، کسی شئے کی حقیقت نہیں۔

۳۔ روح کا تعلق عالمِ مثال میں کبھی رہنے کا نہیں، نہ بدن سے متعلق ہونے سے پہلے نہ بعد ازاں۔

۴۔ مفارقتِ بدن کے بعد روح اور اطوارِ روح کو عالمِ مثال میں ٹھہرانا روح کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔

اب غور فرمائیے کہ انبیائے کرامؑ کی ارواحِ قدسیہ، ان کے برزخی احوال اور ان کے معاملاتِ قبر کو عالمِ مثال کے امور بتلانا اور پھر اسے فیصلہ کن ٹھہرانا کس قدر شانِ علم و دیانت ہے۔

المبحث السادس

فی معنی القبر

قبر اپنی وسعت اور کشادگی کے اعتبار سے فقط اِس زمینی نشان کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک عالمِ برزخ کی منزل ہے، جس کا ایک پہلو یہ زمینی نشان ہے اور اس کی باقی حدود و اطراف کو اللہ ربّ العزت ہی جانتے ہیں۔

آپ کسی میّت کے لیے کوئی گڑھا کتنا ہی فراخ کیوں نہ بنا دیں۔ اللہ تعالیٰ اگر مُعاملہ کرنا چاہیں، تو اسے تنگی کی آخری انتہا تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ اتنا ہی فراخ رہے۔ اسی طرح کسی بندۂ خدا کے لیے کوئی قبر کتنی ہی تنگ کیوں نہ بنا دی جائے، وہ رحیمِ مُطلق جب چاہے، تو اسے حدِ نظر سے بھی زیادہ فراخ کر دیتا ہے، اگرچہ بظاہر اس زمینی نظام میں کوئی خاص تبدیلی ظہور پذیر نہ ہو۔ اس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ ظاہری قبر عالمِ برزخ کا صرف ایک پہلو ہے، جس کی اگلی وُسعت و فسحت کو اللہ ربّ العزت ہی جانتے ہیں یا وہ بندگانِ خدا اس پر اطلاع پاتے ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ اس کا انکشاف کرامت فرما دیتے ہیں۔

ایک غلطی کا ازالہ

بعض لوگ صُوفیائے کرام کے اِن ارشادات سے کہ "قبر حقیقت میں اس ظاہری زمین نشان کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک عالمِ برزخ کی منزل ہے" —— اِس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ عالمِ برزخ اِس ظاہری قبر سے ایک

بالکل جُدا حقیقت ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ امرِ واقع یہ ہے کہ عالمِ برزخ کو اِس ظاہری قبر سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے؛ ہاں قبر اپنی وُسعت وفسحت کے اعتبار سے اِس زمینی نشان تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک برزخی[1] منزل ہے، جس کا ایک پہلو یہ ظاہری قبر اور اُس کی باقی حدود اِس پردے میں ہیں، جسے کہ برزخ کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ ظاہری قبر حقیقتِ قبر سے کلّیۃً جُدا نہیں، بلکہ صرف بعض اعتبارات سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برزخی مشاہدات میں بھی اِس ظاہری نشان پر قبر کا اطلاق بکثرت وارد ہے۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ عالمِ برزخ کا ایک پہلو یقیناً یہ ظاہری قبر ہے، اِسے حقیقتِ قبر سے کنایہ قرار دینا تو خیر سمجھ میں آ سکتا تھا، لیکن مجازہی مجاز[2] کہے چلے جانا بالکل خلافِ واقع ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم، ایک قبرستان سے گزرے۔ آپ نے دو شخصوں کو عذاب ہوتے ہوئے دیکھا؛ ایک ان میں سے پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچتا تھا اور دوسرا چغلی کھانے کا عادی تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان دونوں کو عالمِ برزخ میں عذاب ہو رہا تھا۔ اب اِس کا اِن ظاہری قبروں سے انکشاف اِس حقیقت کا پتہ دے رہا ہے کہ حقیقتِ قبر اِس ظاہری زمینی نشان سے کلّیتہً علیحدہ نہیں، بلکہ یہ علیحدگی صرف وُسعت وفسحت وغیرہ کے اعتبار سے ہے۔ (وراجع له البخاری جلد ۱ ص ۱۸۴)

اسی طرح آں حضرت کا اُس عورت کے متعلق جو مسجد میں جھاڑو دیا

---

[1] ان القبر اول منازل الآخرة (مستدرک جلد ۱ ص ۳۷۱) واحوال البرزخ اشبه باحوال الآخرة (فتح الباری پ ۳ ص ۲۷۹)۔ [2] عن ابن فورک انه صلی الله علیه حی فی قبره رسول الله الی الابد حقیقة لا مجازاً قال ابن عقیل من الحنابلة هو صلی الله علیه وسلم حی فی قبره یصلی (الروضة البهیة فیما بین الاشاعرة والماتریدیه ص ۴۰ مطبعہ حیدرآباد دکن)

کرتی تھی، یہ فرمایا:۔

دُلُّوْنِیْ عَلٰی قَبْرِھَا۔	مجھے اُس کی قبر کا پتہ بتاؤ
(بخاری جلد ۱ ص۱۷۸)	

یقیناً اسی ظاہری زمینی نشان ہی سے متعلق تھا اور پھر آپؐ کا یہ اعلان:۔

اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰی اَهْلِهَا وَاِنَّ اللّٰهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِیْ۔ (مسلم)	بے شک یہ قبور اپنے مدفونین کے لیے تاریکی سے اٹی پڑی ہیں اور اللہ تعالیٰ میرے نمازِ جنازہ پڑھنے سے انھیں نورانی بنا دیتے ہیں۔

یہ ارشاد بھی بتا رہا ہے کہ ظلمت و نور کا محل یقیناً وہی ظاہری قبور ہیں، جو هٰذِهٖ کا مشار الیہ ہیں۔ ہاں اس کے باقی برزخی پہلو اور وسعت و فسحت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، وہ اس ظاہری نشانات کی ظاہری حدود میں منحصر نہیں۔

آں حضرتؐ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی جس برزخی زندگی میں نماز پڑھتے دیکھا تھا، اُس کا انکشاف اس ظاہری قبر سے ہی ہوا تھا، جو سرخ ٹیلے کے پاس تھی۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کہ عالمِ برزخ کو اس ظاہری قبر سے کوئی تعلق نہیں، کس قدر مقامِ افسوس اور محلِ حیرت در حیرت ہے۔

آں حضرتؐ نے اس حدیثِ حیاتِ انبیاءؑ میں صرف یہ نہ فرمایا "اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ" (انبیاءؑ زندہ ہوتے ہیں)، بلکہ اس کے ساتھ "فِیْ قُبُوْرِهِمْ" (اپنی اپنی قبروں میں) کی وضاحت بھی فرمائی۔ تاکہ کوئی یہ گمان نہ کر سکے کہ انبیائے کرامؑ کی برزخی حیات صرف روحانی ہوتی ہے۔ "فِیْ قُبُوْرِهِمْ" کے الفاظ سے اس پر متنبہ فرما دیا کہ یہاں محلِ حیات وہی ہے، جسے قبروں میں رکھا جاتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ انبیاے کرام کے اجسامِ عنصریہ ہی بعد الوفات قبور میں اُتارے جاتے ہیں، پس ان کی حیات کا بیان ان قبور کے ذکر کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کر رہا ہے کہ انبیاے کرامؑ کی برزخی حیات صرف رُوحانی نہیں، بلکہ عنصری اور جسمانی ہے۔

پھر یہی نہیں کہ آں حضرتؐ نے حیاتِ انبیاؑ کی وضاحت فی قبورہم کے الفاظ سے کی، بلکہ آپ نے یصلّون (کہ وہ نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں) کی تصریح فرما کر حیاتِ جسمانی کو اور روشن کر دیا۔ اس لیے کہ نماز کسی وجودِ جسدی کو چاہتی ہے۔

الصلوٰۃ تستدعی جسداً حیّاً (حاشیہ نسائی)

اَفصحُ العربِ والعجمِ صاحبِ جوامعِ الکلم نے کس جامع اور بلیغ انداز میں ارشاد فرمایا تھا:-

الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون —— انبیاے کرامؑ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔

۱۔ اَحیاءٌ میں حیات کا بیان جملہ اسمیہ کے استمرار کے ساتھ تھا۔

۲۔ فی قبورہم میں حیات کے عنصری جسمانی ہونے کی وضاحت ہوئی۔

۳۔ یُصلّون میں حیاتِ حقیقی کا، جس میں اعمالِ طیبہ سے تعطل نہ ہو، بیان ہوا۔

پس بفحواے حدیثِ شریف آں حضرتؐ اپنے روضۂ شریفہ میں (تاثیرِ روح یا دخولِ روح سے) اپنے جسدِ عنصری کے ساتھ فائز الحیات ہیں اور بدستور اشتغالِ طیبہ میں استغراق ہے۔ یہ عمل تلذذاً ہے نہ کہ وجوباً:-

تلذذاً لِاَنَّ التکلیفَ اِنقطعَ بالموتِ (عزیزی ص ۳۴) یہ عبادت تلذذاً ہے، کیونکہ مکلف ہونا ورودِ موت کے بعد ختم ہو چکا ہے۔

الفصل الرّابع

وفیه ثلٰثۃ من المباحث

ارشادِ نبوّت

عن ابی ہریرۃؓ عن النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من صلی علی عند قبری سمعتہ و من صلی علی نائیًا ابلغتہٗ۔

مشکوٰۃ شریف ص۸۷ ابو الشیخ اصبہانی (مرقات جلد۲ ص۱۰)

ابن حبان (مرقات) - ابن ابی شیبۃ (شفا بشرح العلی القاری

جلد۲ ص۱۴۲ مصر)۔ بیہقی (حیات الانبیاء ص۱۲ مصر) -

القول البدیع للمحدث السخاوی ص۱۱۶ -

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آں حضرتؐ نے ارشاد فرمایا، جو میری قبر کے پاس آکر مجھ پر درود پڑھے، اسے میں خود سنتا ہوں اور جو مجھ پر دور سے درود پڑھے، وہ مجھے فرشتوں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔

اس حدیث میں آں حضرتؐ کے اپنے روضۂ اطہر میں زندہ ہونے پر واضح دلالت موجود ہے اور یہ کہ آپؐ اس صلوٰۃ و سلام کو جو روضہ پہ حاضر ہو کر عرض کیا جائے، خود بغیر کسی واسطہ کے سنتے ہیں، لیکن جو دور سے پڑھا جائے، وہ فرشتوں کے توسط سے پیش کیا جاتا ہے۔

المبحث الاوّل

کن کن ائمۂ کبار اور ائمۂ فن نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے اور کن کن اعیان

اُمت نے اس کے مضمون کو صحیح تسلیم فرمایا ہے۔

(۱) خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ۔ (۲) حافظ سخاویؒ۔ (۳) شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ۔ (۴) امام مُلّا علی قاریؒ۔ (۵) قاضی ثناء اللہ صاحب محدث پانی پتیؒ (۶) علامہ طحطاویؒ (۷) نواب صدیق حسن خان صاحبؒ (۸) شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۹) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (۱۰) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ (۱۱) حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ

حوالجات از بعض اشارات

۱۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ :۔

اخرج ابوالشیخ فی کتاب الثواب بسند جید بلفظ من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیا بلغته"۔ (فتح الباری پ ۱۳ ص ۲۷۹)

ابوالشیخ اصبہانیؒ عمدہ سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا جو میری قبر کے پاس درود پڑھے، اسے میں خود سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھا جائے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

۲۔ محدث سخاویؒ :۔

من صلی علی من بعید اعلمته رواہ ابوالشیخ وسندہ جید

——— اس حدیث کی سند جید ہے۔ (القول البدیع ص ۱۱۶)

۳۔ حافظ ابن تیمیہؒ :۔

فاخبر صلی اللہ علیہ وسلم انہ یسمع الصلوۃ من القریب ویبلغ ذلک من

آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ وہ قریب سے پڑھے جانے والے درود کو خود سنتے ہیں اور دور سے پڑھا ہوا پہنچایا جاتا

البعید۔ (رسائل ابن تیمیہ ص۱۹۶) ہے۔

۴۔ امام ملّا علی قاری علیہ رحمۃ ربہ الباری:۔

وروا ابو الشیخ و ابن حبّان فی کتاب ثواب الاعمال[1] بسند جیّد۔ (مرقات جلد۲ ص۱)

ابو الشیخ اصبہانیؒ اور ابن حبّانؒ دونوں نے اس حدیث کو سندِ جیّد سے نقل فرمایا ہے۔

۵۔ محدث قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ:۔

انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی غائبا بلغتہ (مظہری جلد۱ ص۳۲۲)۔

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو مجھ پر درود میری قبر کے پاس پڑھے، اسے میں خود سنتا ہوں اور دور کا مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

۶۔ علامہ طحطاویؒ:۔

(فانہ یسمعہا) ای اذا کانت بالقرب منہ صلی اللہ علیہ وسلم (وتبلغ الیہ) ای یبلغہا الملک الیہ اذا کان المصلی بعیداً۔ (طحطاوی ص۲ مصر)

جب درود پڑھنے والا آپ کے قریب ہو تو آپ خود سنتے ہیں اور جب وہ دور ہو تو پھر اس کا درود فرشتوں کی وساطت سے آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔

۷۔ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ:۔

اسنادہ جیّد (الدلیل الطالب ص۸۴۴) اس حدیث کا سلسلۂ اسناد جیّد اور عمدہ ہے۔

---

[1] کتاب کا اصل نام ثواب الاعمال ہے۔ کہیں کہیں اس کا نام اختصاراً کتاب الثواب بھی ملتا ہے۔ حدیث زیرِ بحث باب الصلوٰۃ میں ہے اس لیے جہاں اس کا حوالہ کتاب الصلوٰۃ کے نام سے ہو وہاں اسے اسی کتاب کا متعلقہ باب سمجھنا چاہیے۔

۸۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ :۔

اخرجہ ابو الشیخ فی کتاب الثواب بسند جید من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی نائیا بلغتہ۔ (فتح الملہم جلد ۱ ص۳۳)

عمدہ سند سے یہ حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا، جو شخص میری قبر کے پاس درود پڑھے، اُسے میں خود سنتا ہوں اور جو دُور سے پڑھے، وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

۹۔ قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ :۔

قبر کے پاس جا کر کہے کہ اے فلاں، تم میرے واسطے دُعا کرو کہ حق تعالیٰ میرا کام کر دے۔ اس میں اختلاف علماء کا ہے۔ مجوّز سماع موتیٰ اس کے جواز کے مقرّ ہیں اور مانعین سماع منع کرتے ہیں۔ سو اس کا فیصلہ اب کرنا محال ہے، مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں، اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے اور دلیلِ جواز یہ ہے کہ فقہاءؒ نے بعد سلام کے وقتِ زیارتِ قبر مبارک کے شفاعتِ مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے۔ پس یہ جواز کے واسطے کافی ہے۔

(فتاویٰ رشیدیہ جلد ۱ ص۹۹)

۱۰۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدّث سہارنپوریؒ :۔

فرمایا کرتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں، لہٰذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہیے۔ مسجدِ نبوی کی حد میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے، اس کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں۔

(تذکرۃ الخلیل ص۳۶)

۱۱۔ حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ :۔

خود حضورؐ کا ارشاد مروی ہے کہ جو شخص میری قبر کے پاس درود پڑھتا ہے،

ص۵ وراجع لہ فتح القدیر جلد ۲ من اواخر کتاب الحج ص۳۳۶ مصر وکذالک فی نور الایضاح ومراقی الفلاح وشرحہ للطحطاویؒ۔

اس کو میں خود سُنتا ہوں اور جو شخص دُور سے درود بھیجتا ہے وہ مجھ کو پہنچائی جاتی ہے یعنی بذریعہ فرشتوں کے، جیسا کہ مشکوٰۃ میں نسائی اور دارمی سے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ آپ کا ارشاد مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ملائکہ زمین میں سیاحت کرنے والے مقرر ہیں کہ میری اُمت کی طرف سے مجھ کو سلام پہنچاتے رہتے ہیں۔

(نشر الطیب ص۱۴۸)

احد عشر کوکباً

المبحث الثانی

امام بیہقیؒ نے اس حدیث کو "شعب الایمان" اور "حیات الانبیاء" دونوں میں روایت کیا ہے۔ "شعب الایمان" تو اس وقت ہمیں میسّر نہیں آسکی، اس لیے اس کی سند کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا؛ البتہ "حیات الانبیاء ص۱۲" مطبوعہ مصر میں امام بیہقیؒ کا سلسلۂ اسناد یہ ہے:

اخبرنا علی بن محمد بن بشران انبأ ابو جعفر الرازی حدثنا عیسیٰ بن عبد اللہ الطیالسی حدثنا العلاء بن عمرو الحنفی حدثنا ابو عبد الرحمٰن عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس سند میں ابو عبد الرحمٰن راوی کون ہے؟ اس کا نام اور ولدیت یہاں مذکور نہیں۔ امام بیہقیؒ کی رائے یہ ہے کہ وہ محمد بن مروان سدی صغیر ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے میزان میں سدی کے ترجمہ میں حدیث مذکورہ نقل کرنے میں بیہقیؒ کی متابعت کی ہے۔ ہمیں اختصارِ وقت نے موقع نہیں دیا کہ امام بیہقیؒ کی اس رائے کی تحقیق کر سکیں کہ آیا یہ وہی راوی ہے یا کوئی اور؟

لطیفہ

ایک جگہ ایک مدعیِ علم کے پاس میں نے اسی خیال کا اظہار کیا وہ جھنجھلا کر کہنے لگے کہ کیا آپ کو امام بیہقیؒ کی مذکورہ رائے سے اتفاق نہیں، آپ اپنے کو ان سے زیادہ عللِ رجال کا ماہر سمجھتے ہیں؟

میں نے گزارش کی کہ جناب کی اپنے متعلق کیا رائے ہے۔ کیا آپ اپنے کو امام بیہقیؒ سے زیادہ بالغ نظر سمجھتے ہیں؟ فرمانے لگے نہیں! اس پر میں نے عرض کیا کہ امام بیہقیؒ تو اسے سدی صغیر معین کرنے اور متکلم فیہ قرار دینے کے باوجود بالکل ساقط الاعتبار نہیں کرتے، بلکہ پہلی روایات کو اس کی تاکید قرار دے کر اس حدیث کو قبول کر رہے ہیں۔ اس پر وہ صاحب پھر جھلا اٹھے کہ کہاں! میں نے کہا دیکھیے—

ابو عبد الرحمن هذا هو محمد بن مروان السدي فيما ارى وفيه نظر وقد مضى ما يؤكده (ص ۱۳ معر)	میری رائے یہی ہے کہ ابو عبد الرحمن سے مراد محمد بن مروان ہی ہے اور اس میں کلام ہے ہاں پہلی روایات اس روایت کی تاکید ضرور کر رہی ہیں۔

پھر کیا تھا لگے امام بیہقیؒ کی شان میں گل کھلانے، میں نے کہا حضرت بتایئے کہ جب مجھے امام بیہقیؒ سے اختلاف ہے تو وہ ایک ماہر فن اور عللِ رجال کے ماہر ہیں اور جب آپ کو ان سے اختلاف ہوا پھر وہ بالغ النظر اور ماہر فن نہیں رہتے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اب لگے دائیں بائیں دیکھنے۔

ہاں پیشِ نظر رہے کہ اس حدیث کا دار و مدار صرف اسی سلسلۂ اسناد پر نہیں جس میں کہ یہ ابو عبد الرحمن وارد ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور سلسلۂ اسناد بھی موجود ہے، جس میں نہ ابو عبد الرحمن ہے اور نہ محمد بن مروان سدی صغیر اور حافظ ابنِ حجرؒ جیسے اربابِ براعت اس اسناد کی صحت پر بھی حکم لگا چکے ہیں۔

کشیفہ

کشیفہ کی وجہِ تسمیہ پہلے گزر چکی - ایک اور مثال ملاحظہ ہو - ایک دفعہ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب رائے پوری، شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ نے ایک علم دوست بزرگ سے فرمایا کہ حدیث الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون کی تصحیح خود امام بیہقی رح نے فرمائی ہے - وہ جھلا کر کہنے لگے کہ چونکہ امام اعظم رح سماعِ موتیٰ کے قائل نہیں اور امام بیہقی رح حضرت امام اعظم رح کے مخالف ہیں - اس لیے انھوں نے اس حدیث کی تصحیح کر دی ہے - تاکہ امام صاحب رح کی مخالفت ہو - (استغفر اللہ! ثم استغفر اللہ!)

مولانا رائے پوری دام برکاتہم نے یہ واقعہ خود میرے سامنے بیان فرمایا - میں نے کہا یہ ہو سکتا ہے کہ جہاں محدثین میں خود اختلاف ہو، وہاں کوئی محدث اپنے فقہی مسلک کی تائید میں کسی ایک موقف کو ترجیح دے دیں، لیکن یہ تو محدثین کی شانِ دیانت کے خلاف ہے، جو کچھ ان کے ذمہ لگایا جا رہا ہے۔

اس کشیفے سے آپ اس طبقے کے ذہن کا پتہ چلائیں، جو محض مسلکی حمایت میں محدثین کی دیانت سے کھیل رہا ہے - اعاذنا اللہ منہا!

دوسری سند

اس حدیث کا دوسرا سلسلہ اسناد جس کے راوی پر جرح نہیں -

ابوالشیخ اصبہانی رح نے اس حدیث کو جس سند سے پیش کیا ہے، اسے حافظ ابن القیم رح نقل فرماتے ہیں :-

قال ابو الشیخ فی کتاب الصلوٰۃ حدثنا عبد الرحمٰن بن احمد الاعرج حدثنا الحسین بن الصباح حدثنا ابو معاویۃ حدثنا الاعمش عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی من بعید اُعلمتہ (جلاء الافہام ص۲۵)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، حافظ سخاویؒ اور مُلا علی قاریؒ جیسے اعیان و اکابر اِس سند کے جید ہونے پر نص فرما چکے ہیں۔ ان کی توثیق کے بعد سارے راویوں کے علیحدہ علیحدہ حالات اور تراجم پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

اعمش عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ عن النبیؐ کا سلسلہ تو دونوں سندوں میں مشترک ہے۔ یہاں اعمش سے لے کے ابو معاویہ روایت کر رہے ہیں اور وہاں ان سے ابو عبد الرحمٰن نے روایت کیا تھا۔ یہ ابو معاویہ ثقہ راوی حدیث ہیں۔ ان کی موافقت سے ابو عبد الرحمٰن کی روایت اور بھی مصدقہ ہو جاتی ہے۔

نوٹ ۱

اِس حدیث کی اکثر روایات میں اُبلغتہ یا بلغتہ کے الفاظ ہیں۔ متنِ مشکوٰۃ اور اِس کے حاشیہ پر اختلافِ نسخہ کا اظہار بھی یہی ہے۔ یہ اعلمتہ کے الفاظ متنِ روایت میں غرابت پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن معنی اور مفہوم چونکہ دونوں کا ایک ہے اِس لیے یہ غرابت کوئی مضر نہیں۔

نوٹ ۲

سلسلۂ روایت حافظ ابو الشیخ اصبھانیؒ

۱۔ ابو الشیخ ——— ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن جعفر بن حبان۔
فھو الحافظ الکبیر .... ثقۃ وغالب ما یرد

بالالف والادوم

(لسان المیزان جلد ۶ ص۲۹۵)

۲۔ عبد الرحمٰن بن احمد الاعرج :۔

کنیت : ابو صالح والد ، ابو یحیٰی الزہری وفات ، ۳۰۰ ھ

ابو صالح عبد الرحمٰن بن احمد الاعرج نے حسین بن صباح ، سلمہ بن شبیب (متوفی ۲۴۶ ھ) محمد بن الزاعفرانی الہمدانی سے روایات لی ہیں اور ان سے محمد بن احمد[1] بن ابراہیم (متوفی ۳۰۳ ھ) اور حافظ عبد اللہ بن محمد بن جعفر[2] وغیرہ ہمارے احادیث روایت کی ہیں ۔

امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں :۔

من روی عنه ثقتان	جس شخص سے دو ثقہ راوی روایت کر
فقد ارتفعت جهالته و ثبت	رہے ہوں ، تو اس کی جہالت مرتفع ہو
عدالته ۔	جاتی ہے اور اس کا عادل ہونا ثابت ہو
(فتح المغیث ص۱۳۷)	جاتا ہے ۔

اور یہاں (عبد الرحمٰن بن احمد الاعرج سے متعلق) تو فقط اسی پر بنیاد نہیں کہ ان سے دو ثقہ راوی روایت کر رہے ہیں ، بلکہ یہاں عبد الرحمٰن بن احمد کی یہ حیثیت بھی پیش نظر رہے کہ وہ سلمہ بن شبیب النیشاپوری کا شاگرد اور راوی حدیث ہے ۔ نیز یہ کہ حافظ عسقلانیؒ وغیرہ محدثین اس پر مشتمل اسناد کو سند جید کہتے ہیں ۔

سلمہ بن شبیب سے روایت لینے والوں کی جلالت شان

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس باب میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

---

[1] ثقہ (لسان المیزان جلد ۵ ص۴۲) ظفر کان اللہ لہ ، [2] ثقہ (لسان جلد ۶ ص۲۹۵) ظفر عفی عنہ

قال ابونعیم الاصبہانیؒ احد الثقات حدث عنہ الائمۃ والقدماء

امام ابونعیم اصبہانیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ راویوں میں سے تھے اور اُن سے ائمۂ فن اور راسخ العلم لوگوں نے احادیث روایت کی ہیں۔

( )

واضح ہے کہ عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج مسلمہ بن شبیب سے حدیث روایت کر کے اس جلالتِ شان پر فائز ہیں۔

حضرت انسؓ کی مرفوع روایت للصائم فی رمضان فی آخر النھار ان یحتجم اور حضرت علیؓ کی مرفوع روایت لا تکرھوا الفتنۃ فی آخر الزمان فانھا تبیر المنافقین (وغیرھا من الروایات) بھی انہی عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج سے مروی ہیں۔

(نوٹ) پیشِ نظر رہے کہ عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج ہرگز ضعیف راوی حدیث نہیں، بلکہ اس انداز میں جس راوی پر محدثین نے کچھ کلام کیا ہے، وہ اس کا بھائی محمد بن احمد بن یزید الزہری ہے۔ اس کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:۔

محمد بن احمد بن یزید الزھریؒ سمع اسمٰعیل بن یزید روی عنہ ابوالشیخؒ والطبرانیؒ وغیرھما قال ابوالشیخؒ لم یکن بالقوی فی الحدیث۔

محمد بن احمد بن یزید الزہریؒ نے اسمٰعیل بن یزیدؒ سے روایت لی ہے اور اُس سے ابوالشیخؒ اور طبرانیؒ وغیرہ نے آگے روایت لی ہیں۔ امام ابوالشیخؒ کی رائے میں وہ کوئی زیادہ ذی الضبط راوی نہ تھے۔

(لسان المیزان ج۵ ص۴۴)

چونکہ یہ بھی حافظ ابوالشیخ اصبہانیؒ کا شیخ روایت ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ کسی کو اِس میں اور اس کے بھائی عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج کے مابین اشتباہ ہو گیا ہو۔

لیکن اس غلط فہمی سے ابوالشیخ کے شیخ روائیت عبدالرحمٰن بن احمد کو مجروح قرار دینا اور ائمۂ فن کی توثیق سے طالب علمانہ سطح پر کھیلنا علم و بصیرت اور نظر و خبرت سے محرومی کی علامت ہے۔

نوٹ ۳۰

نیز از ابن عمرؓ آمدہ من صلی علی عند قبری ردت علیہ و من صلی علی فی مکان آخر بلغونیہ۔ (جذب القلوب ص۲۱۹)

یہ روایت ان روایات سے علیحدہ اور ایک بالکل مستقل روایت ہے اس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ اگر کہا جائے کہ ایک سند میں سے خلال نے بختری کے طریق سے بھی روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے تو ہم عرض کریں گے

تعدد الطرق یفید القوۃ (اعلاء السنن جلد ۱۰ ص۳۳۵)

نوٹ ۳۱

واخبرنا ابو عبد اللہ الحافظ انبأ ابو عبد اللہ الصفار حدثنا ابوبکر بن ابی الدنیا حدثنی سوید بن سعید حدثنی ابن ابی الرجال عن سلیمان بن سحیم قال رایت النبیؐ فی النوم فقلت یا رسول ھؤلاء الذین یأتونك فیسلمون علیك اتفقه سلامهم قال نعم وارد علیهم رواه البیهقی ص۱۳ مصر۔

(ترجمہ) سلیمان بن سحیم کہتے ہیں کہ میں نے آں حضرتؐ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! یہ لوگ جو آپ کے پاس آتے ہیں اور سلام پڑھتے ہیں، کیا آپ ان کے سلام کو سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں اور میں اس کا جواب بھی دیتا ہوں۔

المبحث الثالث

بعض حضرات اس حدیث کے الفاظ "من صلی علیّ عند قبری سمعتہ"
میں سمعتہ (میں خود سنتا ہوں) کا مطلب یہ بیان کر رہے ہیں کہ اللہ رب العزت
نے آپ کے روضۂ شریفہ پر ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آپ پر امت کا سلام
و صلوٰۃ پیش کرتا ہے، یہاں اس سے سننا مراد ہے۔ درود پڑھنے والے سے سننا مراد
نہیں۔ (استغفر اللہ!) - دیکھیے کس طرح مطلب موضوع کیا جا رہا ہے اور مرادِ حدیث
کو بگاڑا جا رہا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ وہ فرشتہ تو اُن لوگوں کے درود پہنچانے کے لیے مقرر ہے جو
دور سے پڑھ رہے ہوں :-

یبلغھا الملک اذا کان المصلی بعیداً (طحاوی ص۳۸۴) - فرشتہ اس وقت درود پہنچاتا ہے
جبکہ پڑھنے والا دور ہو اور جو خود روضہ پر حاضر ہوں اور صلوٰۃ و سلام بالکل سامنے ہو کر عرض کر رہے
ہوں وہ صلوٰۃ و سلام آپ خود سنتے ہیں۔ (دیکھیے السعی المشکور مولانا عبدالحی لکھنوی ص۱۱۴) -

ثانیاً: براہِ راست سننا اصل ہے اور بالواسطہ سننا صرف عن الظاہر، اور بلا وجہ
اصل کو چھوڑنا صحیح نہیں۔

ثالثاً: یہاں سمعتہ کے الفاظ ابلغتہ کے مقابلہ میں وارد ہیں، پس اگر
سمعتہ کا وہی معنی مراد لیں، جو یہاں گھڑا جا رہا ہے، تو اس کا تقابل اگلے مضمون
ابلغتہ، سے قائم نہیں رہتا، اس لیے کہ وہ معنی تو خود اگلے مضمون میں نظر آ رہے
ہیں۔ پھر تقابل کیا اور ربطِ مضمون کیا۔

رابعاً شارحین حدیث نے اس سمعتہ سے براہِ راست خود سننا ہی مراد
لیا ہے :-

من صلی علی عند قبری سمعتہ ای سماعاً حقیقیاً بلا واسطۃ

(مرقات جلد ۲ صنا مصر)

وکذالک فی الدرۃ المضیئۃ فی الزیارۃ المصطفویۃ للملا

علی القاری علیہ رحمۃ ربہ الباری -

علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ شرح ہمزیہ میں لکھتے ہیں :-

اذا صلی وسلم عند قبرہ سمعہ سماعاً حقیقیاً و یرد علیہ من

غیر واسطۃ وان صلی وسلم علیہ من بعید لا یسمعہ الا بواسطۃ

یدل علیہ احادیث کثیرۃ -

تم الباب الاول والحمد للہ علی ذالک وھو

المستعان وعلیہ التکلان -

الباب الثانی وفیہ ثلٰثۃ فصول

الفصل الاوّل

مسلکِ خُلفائے راشدین

شانِ ورود خطبۂ حضرت صدیقِ اکبرؓ

حضور پیغمبر خاتمؐ کی احادیث شریفہ روضۂ منورہ کی حیاتِ جسمانی کے بیان میں یکے بعد دیگرے آپ کے سامنے آچکیں۔ اب اس باب میں افضل البشر بعد الانبیاء سیدنا حضرتِ صدیقِ اکبرؓ کا فیصلہ بھی ملاحظہ ہو۔ وفات النبیؐ کا سب سے پہلا اعلان بھی حضرت صدیقِ اکبرؓ ہی کی زبانِ فیض ترجمان سے صادر ہوا تھا۔ اب اس کے بعد کی حیات النبیؐ کا فیصلہ بھی اسی خطبۂ صدیقی میں ملاحظہ کیجئے۔ ان سے بڑھ کر اور کون فطرتِ نبوّت کا نبض شناس ہو سکتا ہے۔ پہلے شانِ ورود دیکھیے:۔

نزولِ وحی کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ ایسی کیفیات طاری ہوتی تھیں کہ اس دنیا کے احساسات کچھ وقت کے لیے منقطع ہو جاتے تھے اور قلبِ منوّر پوری طرح عالمِ بالا کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ ان انکشافات میں بظاہر غشی وغیرہ کا گمان ہونے لگتا اور اتمامِ وحی کے بعد آپ پھر اس کیفیت ملکی سے کیفیتِ بشری کی طرف منتقل ہو جاتے۔ جب روح الامین آپ کے قلبِ مبارک پر نزول فرماتے تو ایسی کیفیات اکثر وارد ہوتی تھیں۔

آں حضرتؐ پر جب "اِذَاقَتِ موت" کا وعدۂ الٰہیہ پورا ہوا تو بعض صحابہؓ نے اس ورودِ وفات کو مذکورہ سابقہ غشی خیال کیا اور گمان کیا کہ ابھی کارِ نبوت کے کچھ

لہ ما مات رسول اللہ ولا یموت حتی یقتل المنافقین (ابن ابی شیبۃ کما فی القسطلانی)۔ فلیقطعن ایدی الرجال وارجلھم (بخاری جلد ا صفحہ ۵۱۷)۔

اہم اُمُور باقی ہیں، آپ انھیں سرانجام دینے کے بعد ہی اس دُنیا سے اِنتقال فرمائیں گے بنا بریں اُنھوں نے نہایت سختی سے کہا کہ کوئی آپ پر وفات شریفہ کے وارد ہو چکنے کی بات نہ کرے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

۱- کیا وُہ لوگ انتہائے غم میں جذبات سے مغلوب ہو کر ایسے خیالات قائم کر رہے تھے؟ یا

۲- ان کا اعتقاد ہی یہ تھا کہ حضورؐ پر وُرودِ موت کبھی نہ ہوگا؟ اور یا

۳- انھیں وُہ موت کی پہچان نہ تھی، کیفیتِ وُرودِ موت اور آثارِ موت کا کوئی تجربہ نہ رکھتے تھے؟ یا

۴- اس اِنکارِ موت کا منشاء کچھ اور تھا؟

جب ہم حضرت فاروقِ اعظمؓ جیسے ذکی الطبع، سلیم الحس اور بیدار مغز انسان کو بھی اِسی صف میں کھڑا دیکھتے ہیں، تو پھر ہمیں اور زیادہ غور و فکر سے سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اس اِنکارِ موت کا سبب کیا تھا؟

جہاں تک پہلے احتمال کا تعلق ہے کہ شاید وُہ لوگ انتہائے غم میں جذبات سے مغلوب ہو کر ایسے خیالات قائم کر رہے تھے یہ ہرگز صحیح نہیں۔ اگر غلبۂ محبت ہی اس کا باعث تھا، تو حضرت سیدۃ فاطمۃ الزہراؓ اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سب سے پہلے ان جذبات کی رَو میں بہ جاتیں۔ پھر حضرت فاروقِ اعظمؓ جیسے مُدبّر اور نزاکت شناس سے بالکُل مغلوب الحال ہو جانے کی توقع بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ نیز ان کا استدلالی پہلو کہ ابھی کارِ نبوت کے کچھ اہم اُمور باقی ہیں، خود اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ ان کے حواس میں اختلال ہرگز نہ تھا ورنہ یہاں وُہ کوئی اجتہاد کرتے نظر نہ آتے۔ خود فرماتے ہیں:-

واللہ ان کنتُ أظنُ انہ صلی اللہ علیہ وسلم سیبقٰی فی أُمّتِہ حتی یشھدَ علیہ بآخر اعمالھا و انہ ھوالذی حملنی علی ان قلت ما قلت" رواہ البیہقیؒ وراجع لہ تفسیر "وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً"

اگر دُوسرے احتمال کو جگہ دیجیے کہ شاید ان کے اعتقاد میں حضورؐ پر وُرودِ موت کبھی ہونا ہی نہ تھا، یعنی وُہ حیات بلاوفات کے قائل تھے، تو یہ بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ اس انکارِ وفات کی جو وجہ حضرتِ فاروقِ اعظمؓ سے منقول ہے، وُہ خود اس کی تردید کرتی ہے۔ ثانیاً حضرت فاروقِ اعظمؓ خود حافظِ قرآن تھے۔ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ یا أَفَاِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ وغیرھا من الآیات ان سے مخفی نہ تھیں۔ پورے قرآن کی تلاوت ان کے شب و روز کا وظیفہ تھا۔ اُن کا علم و فہم بھی کچھ مشتبہ نہ تھا۔ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ آپؐ پر یقیناً لذّتِ موت کا وعدہ الٰہیّہ پورا ہوگا۔ حضرت امامِ شاہ ولی محدّث دہلویؒ ارشاد فرماتے ہیں :-

بایدوانست کہ قصہ دلالت می کند برآں کہ فاروقؓ می دانست کہ موت برآں حضرتؐ شدنی است پس مخالفِ آیتِ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ اعتقاد نہ کردہ بود لیکن گمان می کرد کہ آنچہ واقع شدہ است موت نیست بلکہ تعطیلِ حواسِ ظاہر است۔

معلوم ہونا چاہیے کہ حضرتِ فاروقِ اعظمؓ یہ جانتے تھے کہ وُرودِ موت آں حضرتؐ پر ہونا ہی ہے۔ پس ان کا اعتقاد آیتِ اِنَّکَ مَیِّتٌ الخ کے خلاف ہرگز نہ تھا، لیکن وُہ خیال کر رہے تھے کہ یہ صُورتِ پیش اُفتادہ موت نہیں، بلکہ صرف آثارِ حیات رُک گئے ہیں، یعنی جو کچھ واقع ہُوا تھا اسے وُہ موت قرار نہیں دیتے تھے۔

(قرۃ العینین ص ۴۷ مطبوعہ دہلی)

اگر تیسرا احتمال سامنے رکھیے کہ انھیں ورودِ موت کی پہچان نہ تھی، تو یہ بھی قرین قیاس نہیں ہے۔ اہلِ عرب سے کچھ کم آشنا نہ تھے۔ ہزاروں انسانوں کو انھوں نے مرتے دیکھا تھا۔ موت کی کیفیات بھی کچھ اُن سے مخفی نہ تھیں اور ایسے مواقع کی نزاکت کا بھی انھیں کوئی کم تجربہ نہ تھا۔

پھر آخر ان کا وقوعِ موت سے انکار کیوں تھا؟ اس کا سبب اور منشا کیا ہے ——؟

حقیقت الامر

بات دراصل یہ تھی کہ جس طرح نزولِ وحی کی بعض کیفیات میں اس دُنیا کے احساسات سے تعطل ہو جاتا تھا مگر حیات کی نفی نہ ہوتی تھی، اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ورودِ وفات کچھ ایسے طریق سے ہُوا کہ حیات کلیۃً منتفی نہ ہُوئی تھی، صرف آثارِ حیات سلب ہو گئے تھے (اور یہ بھی اس لیے تھا کہ عالمِ برزخ میں انتقال ہو سکے اور پردۂ قبر میں تشریف لے جاسکیں)۔ حضرت فاروقِ اعظم کی نگاہیں اس حیاتِ قلب تک پہنچ رہی تھیں، جو زیرِ پردہ مستور تھی (آخر محدثیت کا مقام کچھ کم منبعِ عرفان نہ تھا) اور اس کے ہوتے ہوئے وہ وقوعِ موت کا ادراک نہ کر سکے تھے۔ اس وجودِ حیات کو اس ورودِ وفات سے تطبیق دینا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے متعلق ان کا اعتقاد یہی تھا کہ آپ پر بھی اسی طرح موت آئے گی، جس طرح کہ عام دوسرے انسانوں پر وارد ہوتی ہے اور چونکہ صورتِ پیش اُفتادہ اور حالتِ واقعہ ایسی نہ تھی اس لیے وہ آپ پر ورودِ وفات کا یقین نہ کر سکے اور خیال رہا کہ یہ مرحلہ ابھی باقی ہے۔ پیشتر ازیں وہ آیتِ شریفہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ کے پیشِ نظر آپ پر قرانِ موت کا تتبع نہ کر سکے تھے۔

پھر جب حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اس صورتِ پیش افتادہ اور کیفیتِ اقدس ہی کو وفات النبیؐ کہا اور آیاتِ قرآنیہ، جن میں آپ پر ورودِ وفات کی پیشگوئیوں یا امکان کا بیان تھا، ان کا منشا اسی قسم کی حالت کو قرار دیا تو اب حضرتِ عمر فاروقؓ سمجھے کہ آیاتِ مذکورہ اپنے عامی مفہوم میں نہ تھیں اور انھیں شرحِ صدر ہو گیا کہ ان آیاتِ شریفہ کا منشا وفات النبیؐ کے متعلق کیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ ان آیات کا مفہوم مجھ پر یوں منکشف ہوا۔

"گویا کہ میں نے پہلے وہ آیات پڑھی ہی نہ تھیں۔"

مقامِ غور ہے کہ اگر یہ آیاتِ شریفہ اپنے اسی عام مفہوم میں ہوتیں، جیسا کہ ابتدائی سطح میں متبادر ہوتا ہے، تو صحابۂ کرامؓ بالخصوص حضرت فاروقِ اعظمؓ ان آیات کے متعلق اتنا اہم اعلان نہ فرماتے۔ حضورؐ کے متعلق "وعدہ موعود" اگر انھی معنوں میں ہوتا، جن معنوں میں کہ موت عام ماحولِ عرب میں متعارف تھی، تو حضرتِ فاروقِ اعظمؓ حافظِ قرآن اور نہایت ذکی الطبع ہوتے ہوئے یہ ہرگز ارشاد نہ فرماتے:۔

کانی لم اقرأها الا یومئذٍ   گویا کہ وہ آیات میں نے اس دن کے سوا کبھی پڑھی ہی نہ تھیں۔

بات صاف ہے کہ آں حضرتؐ پر وفاتِ شریفہ کا ورود کچھ ایسے طریق سے ہوا، جو عام دوسرے انسانوں سے مختلف تھا۔ آپ کے جسدِ میت سے قرائنِ موت کچھ ایسے جلی نہ تھے کہ کسی کو شک کی گنجائش نہ مل سکے۔ آپ پر کچھ ایسی کیفیات وارد تھیں کہ موت کا یقین نہ ہوتا تھا۔ اسی کیفیت نے جو زیرِ پردہ مستور تھی، اشتباہ پیدا کر رکھا تھا۔ جن کے خیال میں اس کیفیت کی قرائنِ موت سے تطبیق محال تھی، وہ ان قرائن کو غشی سمجھتے رہے کیونکہ ان کے حاشیۂ فکر میں موت کے صرف وہی معنی تھے، جو عام طور پر معروف ہیں اور جس ہستیِ مقدس کو رازدارِ نبوت ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اس نے اس کیفیتِ باطنیہ کو جو زیرِ پردہ مستور تھی، ورودِ وفات سے متضاد نہ جانا تھا، اسی وجودِ حیات اور

وُقوعِ وفات میں کوئی تعارض خیال نہ کیا۔ اعلان فرمایا:۔

اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ حضور موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔

(بخاری)

جب حضرت صدیق اکبرؓ نے اس صورتِ پیش اُفتادہ ہی کو وفاتِ پیغمبر قرار دے دیا، تو پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے آپ پر قرآنِ موت کا تتبع شروع کیا اور بالآخر وُقوعِ وفات کے قائل ہو گئے۔ باقی سب صحابہؓ نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

یعنی قول اُو کَاَنِّی لَمْ اَسْمَعْھَا ایںست کہ استماعِ ایں آیت مآل گردید اور را بہ تتبعِ قرآنِ دمیدن ایں مسئلہ بآں نداشت۔ (قرۃ العینین ص ۲۷)

آپؓ کے اس ارشاد "گویا کہ یہ آیات میں نے پہلے سنی ہی نہ تھیں" کا مطلب یہی ہے کہ اس آیت کے استماع نے انہیں تتبعِ قرآن کی طرف متوجہ کر دیا (کہ یہ صورت پیش اُفتادہ ہی اس آیت شریفہ کا مورد ہے) اور پیشتر ازیں آپؓ کا (اس آیت کے) اس معنی کی طرف دھیان نہ تھا۔

جس طرح ورودِ وفات پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہو گیا، اسی طرح یہ بھی ایک اجماعی حقیقت قرار پائی کہ آپؐ کی وفات عام دوسرے انسانوں کی موت سے یقیناً مختلف ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی وفات سے وہ معاملہ ہرگز نہ کیا گیا جو عام ایسے دوسرے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس موت کی نوعیت عام انسانوں سے کچھ مختلف سمجھی۔

تنوعِ موت پر پہلی شہادت

کہ صحابہ کرامؓ نے اجماعاً آپؐ کی وفات سے دوسری اموات والا معاملہ نہ کیا۔

اختصاصات لوفات سیّد الکائنات

۱۔ آپؐ کو آخری غسل پہلے پہنے ہوئے کپڑوں ہی میں دیا گیا۔ کرتا تک جسدِ اطہر سے نہ اُتارا گیا۔

۲۔ نمازِ جنازہ بھی عام اموات مسلمین کی طرح نہیں پڑھی گئی، بلکہ اسے کسی دوسرے طریق سے ادا کیا گیا، بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ معروف نمازِ جنازہ کی بجائے صرف صلوٰۃ وسلام عرض کیا گیا اور آپؐ کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپؐ کے لئے دعا کی گئی۔

۳۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مُردوں کے دفن کرنے کے بارے میں تاخیر نہ کرنے کا جو عام تاکیدی حکم شریعت میں ہے، اس کے برخلاف قریباً پورے دو دن گزر جانے کے بعد آپؐ کو دفن کیا گیا اور اس غیر معمولی تاخیر میں کوئی حرج نہ سمجھا گیا اور کوئی اندیشہ محسوس نہیں کیا گیا اور کسی ایک صحابیؓ نے بھی اس معاملہ میں جلدی کرنے کا تقاضا نہ کیا۔

۴۔ پھر آپؐ کی ایک خاص ہدایت کے مطابق آپؐ کی پہلی زندگی کے عزیز مسکن یعنی حضرت صدیقہؓ کے حجرہ ہی کو آپؐ کا مدفن اور آپؐ کی دائمی آرام گاہ بنا دیا گیا اور آپؐ اسی میں دفن کیے گئے۔

۵۔ اسی طرح آپؐ کی ایک ہدایت کے مطابق آپؐ کی املاک میں ترکہ اور وراثت کا عام قانون جاری نہیں کیا گیا، بلکہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں ان کا جو مصرف اور نظام تھا

وہی بدستور قائم رکھا گیا - اور وہ خلافت کی تولیت میں رہیں -

۶- اسی طرح آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ کا یہ حق سمجھا گیا کہ وہ اپنے مسکونہ حجروں کو تازیست اپنے استعمال میں رکھیں اور رسول اللہؐ کے املاک سے اپنا نفقہ تاحیات حاصل کرتی رہیں ، جیسا کہ حضورؐ کے سامنے ان کو یہ دونوں حق حاصل تھے ، حالاں کہ کسی مسلمان کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ کے یہ حقوق صرف عدت کی مختصر مدت تک رہتے ہیں -

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم ان واقعات کی روشنی میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"ان سب استثنائی اور اختصاصی احکام و معاملات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی نوعیت دوسرے تمام لوگوں کی موت سے بہت کچھ مختلف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بات سے ہمارے حلقے کے کسی صاحب علم کو اختلاف ہوگا"-

تنوعِ موت پر دوسری شہادت

کیا موت کے علاوہ اور کوئی کیفیت بھی ہے جو اس کی طرح تمام زندہ انسانوں پر وارد ہوتی ہے؟ اس کے متعلق پتہ کیجیے کہ کیا شریعتِ مطہرہ نے اس کے معنوں میں بھی تنوع پیدا کیا ہے اور انبیاؑ کو غیر انبیاؑ سے اس باب میں بھی ممتاز فرمایا ہے؟

ہاں نیند بھی موت کی طرح تمام زندہ انسانوں کی فطرت ہے اور تمام زندہ انسانوں پر وارد ہوتی ہے ، چنانچہ کہا گیا ہے :-

اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ[1] - نیند موت کی بہن ہے -

---

[1] جاء في الحديث النوم اخو الموت (فيض الباري جلد ۱ ص۱۸۲ مصر) ويجمع حديث النوم اخو الموت ولا يموت اهل الجنة من الجامع الصغير (نعمة الاسلام للشيخ الانور ص۳۳۱) وكذلك في كتاب الروح ص۵۹ والتعليقات القسطاس على النبراس ص۳۳۱ -

اگر انبیاءؑ اور غیر انبیاء میں "تنوعِ نیند" ثابت ہے تو ہر دو طبقوں میں "تنوعِ موت" کیسے ثابت نہ ہوگا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

"ان عینی تنامان ولا ینام قلبی ۔ (رواہ الشیخان)

میری صرف آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سوتا، وہ بیدار رہتا ہے۔

ایک مرسل روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا :۔

انا معاشر الانبیاء تنام اعیننا ولا تنام قلوبنا ۔

ہم لوگ جو انبیاء ہیں، ہماری صرف آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سویا کرتے۔

(اخرجہ ابن السعد کما فی الخصائص)

وکذالک الانبیاء تنام عینا ہم ولا تنام قلوبہم ۔

انبیائے کرامؑ کی صرف آنکھیں سویا کرتی ہیں دل نہیں سوتے۔

(بخاری)

خاتم المحدثین مولانا السید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

عدم نقض الوضوء بالنوم من خصائص الانبیاء ۔

سونے سے وضو نہ ٹوٹنا یہ انبیائے کرامؑ کی خصوصیت ہے۔

(العرف الشذی ص ۔۔)

انبیائے کرامؑ کی یہ شان ہے کہ اس نیند کی حالت میں بھی ان کے ادراکات جاری رہتے ہیں۔ ان کے ادراک کی نوعیت بھی ہمارے ادراک کی نوعیت سے مختلف ہے نیند کی طرح ادراک میں بھی تنوع ہے۔ انبیائے کرامؑ کی نیند کے ادراکات بھی ایک قسم کی وحی سمجھے جاتے ہیں۔ رُؤْیَاءُ الْاَنْبِیَاءِ وَحْیٌ (ترمذی) اس کی تصدیق ہے۔ انبیاءؑ کی نیند اور دوسروں کی نیند میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان کے منامی ادراکات بھی وحی کا مقام

رکھتے ہیں۔ حضرت عمران بن حصین رضؓ کہتے ہیں

کنا لا نوقظ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من منامہ اذا نام حتی یستیقظ۔ (صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۴۷)	ہم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند سے کبھی نہ جگاتے تھے، جب تک کہ آپ خود بیدار نہ ہوجاتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش میں نکلے تو حضرت یوشع بن نونؑ ان کے ساتھ تھے۔ جب یہ منزلِ مقصود پر پہنچے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھ لگ گئی، حضرت یوشعؑ نے فرمایا:۔

لا اوقظہ (بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۸۹) میں آپ کو بیدار نہیں کروں گا۔

انبیاء کو خوابِ استراحت سے اس لیے نہیں اٹھایا جاتا کہ معلوم نہیں ان پر کیا اسرار منکشف ہو رہے ہوں۔ ان کے لیے سبب حرج کیوں بنا جائے۔ شیخ الاسلام مولانا بدر عالم میرٹھی ثم المدنی لکھتے ہیں:۔

"پھر جب ان کی نیند صرف آنکھوں تک محدود رہتی ہے، تو اس سے ان کی موت کا بھی کچھ اندازہ کرلینا چاہیے، کیونکہ النوم اخو الموت مشہور ہے، وہ بھی نیند کی طرح ان پر طاری ضرور ہوتی ہے، مگر عام بشر کی موت کی طرح نہیں، یہاں بھی ان کو شانِ امتیاز حاصل ہوتا ہے، حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر زندہ کا اطلاق آیا ہے"۔

(ترجمان السنۃ جلد ۳ صفحہ ۲۵۸)

۵۔ سیرت کی کتابوں میں ایک باب ہے رحلت کا

کم فہم سمجھتے ہیں، ہے موت یہ ہم جیسی!

ان حقائق کی روشنی میں غور فرمایئے کہ تنوعِ موت کا انکار اور پھر اسے شرعی مدارک چھوڑ کر احداث فی اللغۃ کے الزام سے رد کرنا کون سی شانِ تحقیق ہے۔ تنوعِ موت کا پتہ چلانے کے لیے تنوعِ حیات کو دیکھیے۔ موت اگر حیات کی ضد ہے تو تنوعِ حیات،

سے "تنوع موت" کہیے لازم نہ آئے گا! علامہ راغب فرماتے ہیں :-

الحیاۃ تستعمل علی اوجہ (المفردات ص۱۳۸) ۔ لفظ حیات کلام عرب میں کئی معنوں میں آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب!

اعتقاد الصدیق لحیات الرفیق

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وفاتِ شریفہ وارد ہوئی، تو حضرت ابوبکرؓ مقامِ سنح میں تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا :-

ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ — آں حضرتؐ پر جو کیفیت وارد ہے، وہ موت ہرگز نہیں۔

بعد میں حضرت عمرؓ خود فرماتے تھے :-

واللہ ما کان یقع فی نفسی الا ذالک۔ — خدا کی قسم! میرے ضمیر کا یہی فیصلہ تھا!

حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے، تو آپؓ نے حضورِ انورؐ کے چہرۂ مبارک سے چادر اٹھائی، آپؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بے اختیار رو پڑے اور حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا :-

بابی انت وامی طبت حیا ومیتا والذی نفسی بیدہ لا یذیقک اللہ الموتتین ابدا۔ (بخاری جلد ۱ ص۵۱۷) اما الموتۃ التی کتب اللہ — میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ حیات و موت دونوں کیفیتوں میں کیسے پاکیزہ ہیں۔ اُس ذات کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو دو موتوں کا ذائقہ کبھی نہ چکھائے گا۔ جو موت

علیك فقد متھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے لکھی تھی وہ آپ

(بخاری کتاب الجنائز جلد ۱ ص ۱۶۶) پر وارد ہو چکی۔

ابن ابی شیبہ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی نے آتے ہوئے حضرت عمر رضی کی یہ بات سُن لی تھی کہ آں حضرتؐ پر جو صورتِ حال پیش ہے، وہ موت نہیں ہے۔

فکشف عن وجھہ ثم اکب علیہ فقبلہ وبکی ثم قال بابی انت وامی واللہ لا یجمع اللہ علیك موتتین اما الموتۃ التی کتبت علیك فقد متھا۔
(صحیح بخاری کتاب المغازی جلد ۲ ص ۶۴۰)

پس آپ رضی نے حضورؐ کے چہرہ سے کپڑا اُٹھایا، آپ پر جھک پڑے، بوسہ دیا اور رو پڑے پھر فرمایا۔ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں کبھی جمع نہ کرے گا۔ جو موت کہ آپ کے لیے لکھی گئی تھی، آپ اس کا ذائقہ چکھ چکے۔

یہاں تین اُمور پیشِ نظر ہیں: اولاً کیا اللہ تعالیٰ نے واقعی آپ کے لیے کسی خاص قسم کی موت لکھی تھی کہ اس کا اس خصوصیت سے تذکرہ کیا جا رہا ہے؟ ثانیاً "میرے ماں باپ آپ پر قربان" عربوں کے محاورات میں یہ جملہ کیا امواتِ مقصہ کے لیے بھی آتا ہے یا اس دعا و تصدیق کے لیے من وجہ حیات لازم ہے؟ ثالثاً یہاں جمع موتتین میں دو موتوں سے کیا مراد ہے؟ ہم یہاں صرف تیسرے بحث کی تفصیل کرتے ہیں۔

مفہومِ موتتین کی تعیین

لا یجمع اللہ علیك موتتین (اللہ تعالیٰ آپ پر دو مرتیں کبھی جمع نہ کریں گے)۔ اس کی شرح میں مختلف باتیں کہی جاتی ہیں۔ پس فکر و نظر سے ان کا جائزہ لینا

چاہیے۔—

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ارشادِ صدیقیؓ حضرت عمرؓ کی تردید کے لیے تھا، کیونکہ اگر آں حضرتؐ کی اس صورتِ پیش اُفتادہ کو موت نہ کہا جائے، تو لازم آتا ہے کہ آپؐ پر موت پھر کبھی آئے گی اور اس طرح گویا کہ آپؐ پر دو موتیں وارد ہوئیں، اس کی نفی کرتے ہوئے حضرتِ صدیقِ اکبرؓ نے آں حضرتؐ پر ورودِ وفات ثابت فرمایا۔

جواباً عرض ہے کہ حضرتِ صدیقِ اکبرؓ کے اس ارشاد لا یجمع اللہ علیک موتتین کا یہ مفہوم ہرگز نہیں۔ حضرتِ عمرؓ کے پہلے خیال کے مطابق اگر اس صورتِ پیش اُفتادہ کو موت نہ کہا جائے اور اس لزوم کو بھی مان لیا جائے کہ اس صورت میں آں حضرتؐ پر پھر کبھی ورودِ وفات ہوگا تو اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ حضرتِ عمرؓ کے خیال کے مطابق حضورؐ پر دو موتیں جمع ہو رہی ہیں، جس کی تردید کی ضرورت حضرت صدیقِ اکبرؓ کو پیش آئی تھی؟ اس لیے کہ جب پہلی صورت ان کے خیال میں موت ہی نہیں، تو پھر آئندہ کے ورودِ موت سے دو موتوں کا اجتماع کیسے لازم آیا؟ اور اگر پہلے ورودِ موت ہو چکا ہے، تو پھر اس پر یہ لزوم کیسے لایا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں آپؐ پر موت پھر کبھی آئے گی۔

"لا یجمع اللہ علیک موتتین۔" تو اسی ذہن پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے، جو پہلے ورودِ موت کا قائل ہو اور صورتِ پیش اُفتادہ کو موت یقین کر رہا ہو، اور ظاہر ہے کہ حضرت عمرِ فاروقؓ اس پہلی ہی وفات کے قائل نہ تھے۔ پس ان کے خیال کے مطابق پھر کبھی موت واقع ہونے سے دو موتوں کا اجتماع ہرگز لازم نہیں آتا کہ حضرتِ صدیقِ اکبرؓ اس کی تردید فرما رہے ہوں۔ جب حضرت عمرؓ پہلی موت ہی کے قائل نہیں، تو ان کی تردید کے لیے یہ جملہ مذکورہ کیسے کار فرما ہو سکتا ہے۔ اس جملہ بلیغہ کا

۱؎ بخاری کے حاشیہ پر علامہ کرمانیؒ کا یہ قول بے شک لکھا ہے "قالہ [illegible] قالہ عمر" (جلد ۱ ص ۱۶۷)
(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

مطلب یقیناً وہی ہے، جو شیخ الاسلام حضرت علامہ عینیؒ بیان فرما رہے ہیں :۔

اراد بالموتتین الموت فی الدنیا والموت فی القبر وھما موتتان المعروفتان المشھورتان فلذلک ذکرھما بالتعریف وھما موتتان الواقعتان لکل احد غیر الانبیاء علیھم السلام فانھم لا یموتون فی قبورھم بل ھم احیاء واما سائر الخلق فانھم یموتون فی القبور ثم یحیون یوم القیمۃ ومذھب اھل السنۃ والجماعۃ ان فی القبر حیوٰۃ وموتا فلا بد من ذوق الموتتین لکل احد غیر الانبیاء۔

(عینی شرح بخاری جلد ۷ ص ۲۶ مصر)

دو موتوں سے مراد ایک اس دنیا کی موت اور دوسری قبر کی موت ہے اور یہ دونوں موتیں تعلیماتِ اسلام میں معروف ہیں اور اسی لیے انھیں معرفہ ذکر کیا گیا ہے، یہ دونوں موتیں انبیاءؑ کے سوا باقی ہر ایک انسان کو پیش آتی ہیں۔ انبیاءؑ کو اپنی قبور میں پھر دوسری موت نہیں آتی، بلکہ وہ وہاں زندہ رہتے ہیں؛ ان کے علاوہ باقی عام لوگوں پر (سوال و جواب کے بعد) پھر قبر میں ورودِ موت ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھیں زندگی قیامت کو ملتی ہے، اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب یہی ہے کہ ماسوائے انبیاءؑ کے باقی سب کے لیے قبر میں موت و حیات دونوں ہیں پس ہر کسی نے دو موتوں کا ذائقہ چکھنا ہے۔

خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ منکرین حیات کا جواب دیتے ہوئے، ایک جواب کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۰) لیکن جلد ۲ ص ۹۴۴ کے حاشیہ میں کچھ اور اقوال بھی لکھے ہیں اور اس قولِ اوّل کو واضح کہنے کے باوجود اسے قیل کے ساتھ ہی لکھا ہے۔ ہمیں بہت تعجب تھا کہ علامہ کرمانیؒ جیسے محقق یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ غور کرنے سے پتہ چلا کہ حضرت عمرؓ کے خیال کی تمہید میں چونکہ اگلا خطبہ تھا اور یہ جو تمہید میں آگیا تھا اس لیے علامہ کرمانیؒ نے اگلے خطبے کے پیشِ نظر اس کو بھی تمہید ہی میں فٹ کر دیا ہے؛ چنانچہ علامہ کرمانیؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں فیہ تمہید لرد مقالۃ عمر (حاشیہ بخاری ص ۵۱۷)۔ محدث سہارنپوریؒ کا اصل فیصلہ اسی [illegible]

واحسن من هذا الجواب ان يقال ان حياته في القبر لا يعقبها موت بل يستمر حيا والانبياء احياء في قبورهم ولعل هذا هو الحكمة في تعريف الموتتين حيث قال لا يذيقك الله الموتتين اي المعروفتين المشهورتين الواقعتين لكل احد غير الانبياء.

احسن ترین جواب یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قبرِ شریف میں پھر ایسی حیاتِ دائمہ حاصل ہو چکی ہے کہ اب اس کے بعد پھر کبھی وُرود موت نہ ہوگا اور انبیائے کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ رہتے ہیں: غالباً یہی وجہ ہے کہ ارشادِ نبوت میں موتتین کو الف لام سے لایا گیا ہے، پس یہ دونوں موتیں (ایک اسی دُنیا میں، دُوسری قبر میں) انبیاءؑ کے سوا باقی ہر انسان پر وارد ہوتی ہیں۔

(فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۲، مصری، ص ۱۴ ۳۶۴ دہلی)

شیخ الاسلام علامہ نور الحق محدث دہلویؒ شارح بخاری لکھتے ہیں:۔

"لا یذیقک اللہ الموتتین ابداً" یعنی بعد از موت بحیاتِ ابدی زندہ خواہی بود از آں کہ وی رضی اللہ عنہ دانستہ بود کہ انبیاءؑ در عالمِ برزخ زندہ اند بخلافِ سائر مسلماناں کہ در وقتِ سوالِ منکر و نکیر زندہ می کنند آں ہا را باز می میرانند، چنانکہ در تفسیر احییتنا اثنتین وامتنا اثنتین گفتہ اند۔"

(تیسیر القاری شرح صحیح بخاری جلد ۳ ص ۲۵۴)

پھر ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:۔

"قولِ مختار و مقرر جمہور ہمیں است کہ [illegible] اذاقتِ موت زندہ اند بحیات دنیوی (تیسیر القاری جلد ۳، ص ۲۶۲)۔

(ترجمہ) ارشادِ نبوت کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دو موتوں کا ذائقہ کبھی نہ چکھائے گا، اس کا مطلب یہی ہے کہ وفاتِ شریفہ وارد ہو چکنے کے بعد

پھر آپ ہمیشہ کی زندگی پائیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ کا عقیدہ تھا کہ انبیائے کرامؑ عالمِ برزخ میں زندہ ہوتے ہیں، باقی عام مسلمان منکر ونکیر کے سوالات کے لیے اپنی اپنی قبروں میں زندہ کیے جاتے ہیں اور پھر ان پر قبر میں دوبارہ ورودِ موت ہوتا ہے۔

پھر ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"موت دوم آنست کہ سائر النّاس را در قبر بعد از سوال منکر ونکیر خواہد بود و ایں جواب موافقِ جمہور علماء است کہ قائل اند بحیاتِ سائر انبیاء در عالمِ برزخ و بایں معنی ناطق است آثار و احادیث چنانکہ بر متتبعاں پوشیدہ نیست و ایں قول نزدِ ما احسن اقوال است۔"

(تیسیر القاری پ ۱۸ جلد ۴، کتاب المغازی ص ۲۱۶)

(ترجمہ) "دوسری موت وہ ہے، جو عامۃ النّاس کو قبر میں منکر ونکیر کے سوالات کے بعد پھر دوبارہ آئے گی۔ یہ جواب جمہور علماء کے فیصلے کے مطابق ہے، وہ عالمِ برزخ میں تمام انبیاءؑ کی حیات کے قائل ہیں۔ اس معنی کی تائید میں آثار و احادیث وارد ہیں؛ چنانچہ تتبع کرنے والے اہلِ تحقیق پر یہ مخفی نہیں اور ارشادِ صدیقی کا یہ معنی ان تمام اقوال سے بہتر ہے، جو اس کی تشریح میں کیے گئے ہیں۔"

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی اس حدیث کی شرح اسی طرح کرتے ہیں:۔

"مراد آنست کہ نمی میرد بموت دیگر در قبر ہمچو دیگراں کہ زندہ گردانیدہ می شوند برائے سوال باز میرانیدہ می شوند و ظاہر آنست	حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مراد اس کلمہ سے یہ تھی کہ دوسرے لوگوں کی طرح آپ قبرِ منور میں دوسری موت کا ذائقہ بالکل نہ چکھیں گے، دوسرے عام لوگوں

کہ موت دیگر نیست بروئے
و بعد از جریانِ سنتِ
الٰہی بر اذاقت موت و
زندہ گردانیدن بعد ازاں
حیات باقی و مستمر خواہد بود
و ممات برآں طاری نخواہد
شد۔ پس ایں سخن اشارہ
است بحیاتِ آں حضرتؐ۔
(مدارج النبوت جلد ۲ صفحہ ۸۹)

کہ قبر میں سوال و جواب کے لیے زندہ کیا
جاتا ہے اور پھر ان پر دوبارہ ورودِ موت
ہوتا ہے۔ آں حضرتؐ پر یہ دوسری موت
کبھی نہ آئے گی۔ ایک دفعہ لذتِ وفات
چکھنے اور پھر زندہ ہونے کے بعد آپؐ
حیاتِ دائمہ سے زندہ ہیں۔ آپؐ پر
پھر کبھی طریانِ موت نہ ہوگا۔ اس ارشاد
عالی میں حضرت ابوبکرؓ کا اشارہ مسئلۂ
حیات النبیؐ کی طرف ہی تھا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ صحیح بخاریؒ کے شارحین علامہ عینیؒ، حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ، شیخ الاسلام نور الحقؒ اور دوسرے اکابر محدثینؒ نے موتِ ثانیہ سے قبر کی موت ہی مراد لی ہے، دوسرے احتمالات عقلاً اور نقلاً صورتِ حال پر قطعاً چسپاں نہیں ہوتے۔ لا یجمع اللّٰہ علیک موتتین کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ موتِ ثانیہ، جس سے مراد قبر کی موت ہے، انبیاءؑ پر ہرگز طاری نہ ہوگی۔ وہ موت کی لذت شناسی کے بعد پھر ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیے جاتے ہیں۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کی بصیرت اور فراست پر قربان! وفات النبیؐ کا اعلان بعد میں فرمایا، پہلے حیات بعد الوفات پر اشارہ فرما دیا، تاکہ وقوعِ موت کی صراحت سے کہیں حیاتِ ثانیہ کی نفی لازم نہ کر لی جائے۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ بھی صحیح بخاریؒ کے حاشیہ پر اہل سنت کی طرف سے منکرینِ حیاتِ قبریہ کا اسی طرح جواب دیتے ہیں:-

والاحسن ان یقال ان حیاته صلی اللہ علیہ و سلم لا یتعقبها موت بل یستمر حیًا والانبیاء احیاء فی قبورھم۔ (حاشیہ بخاری جلد ۱ ص۵۱۷)	بہترین جواب یہی ہے کہ ایک دفعہ موت چکھنے کے بعد حضور انورؐ کی حیات ایسی ہے کہ پھر اس پر کبھی موت نہ آئے گی اور آپؐ دائمی طور پر انبیاءؑ کی طرح اپنے روضہ میں فائز الحیات رہیں گے۔

غور فرمائیے، حضرت صدیق اکبرؓ کی بصیرت اور فطرتِ نبوت کی مزاج شناسی کہاں تک پرواز کر رہی ہے۔ کتنی دُھن کی بات آپؓ نے ایک جملے میں ارشاد فرمادی اور کس شان سے آپؓ کے لیے حیات بعد الوفات کا اثبات فرمایا۔ جامعیت شان اور بلاغت بیان نے جس طرح یہاں سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے۔ اس کی نظیر کلام عرب میں شاید ہی کہیں ملے۔

ورودِ وفات کا پہلا اعلان بھی حضرت صدیق اکبرؓ ہی نے کیا تھا۔ اہلِ نکتہ پر قربان جائیے کہ وفات کا اس وقت تک اعلان نہیں فرمایا۔ جب تک کہ اس کے ساتھ ہی بعد الوفات کی حیات کا اثبات نہیں فرما دیا۔

تنبیہ

پیشِ نظر رہے کہ "لا یذیقك اللہ الموتتین ابدًا" کی شرح میں شیخ الاسلام حضرت علامہ عینیؒ اور دوسرے اجلہ محدثینؒ نے حیات فی القبر کے جس مسئلے کو بیان فرمایا ہے، اسے صرف اپنی رائے یا اپنا نظریہ یا صرف اپنی ہی توجیہ قرار نہیں دیا، بلکہ اسے

پورے اہلِ سُنّت کا مذہب قرار دیا ہے جس کا انکار خروج عن اہل السنّۃ ہے ۔

و مذهب اهل السنة و الجماعة ان فی القبر حیوة و موتًا فلا بد من ذوق الموتتین لکل احد غیر الانبیاء ۔ (عینیؒ جلد، صفحہ مصر)	پورے اہلِ سُنّت کا مذہب یہی ہے کہ قبر میں زندگی اور موت دونوں ہیں ۔ پس ہر ایک کو دو موتوں کا ذائقہ چکھنے سے چارہ نہیں ، ہاں انبیاے کرامؑ پر یہ دُوسری موت کبھی نہ آئے گی ۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے بھی اسی اندازِ بیان کو اختیار فرمایا ہے کہ "حیوٰۃ فی القبر" کے منکرین اہلِ سُنّت میں سے نہیں اور انھیں جواب دینا اہلِ سُنّت کے ذمّہ ہی ہوتا ہے ۔

قد تمسك به من انکر الحیوة فی القبر و اجیب عن اهل السنة ...... ان حیوته صلی الله علیه وسلم فی القبر لا یعقبها موت بل یستمر حیًا ۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۲۲)	حیوٰۃ فی القبر کے منکرین کبھی کبھی اس خطبۂ صدیقی رضؓ ہی کو اپنا استدلال بناکر پیش کر دیتے ہیں ۔ ان کے لیے اہل السنّت کی طرف سے یہی جواب ہے کہ حضورؐ اپنے روضہ میں دائمی طور پر زندہ ہیں ۔ انھیں وہاں پھر موت کبھی نہیں آئے گی ۔

اعتقاد الفاروق الاعظمؓ لحیات النبی الخاتمؐ

حضرت صدیقِ اکبرؓ کا عقیدہ تو آپ کے سامنے واضح ہو چکا ، اب حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کا اعتقاد بھی ملاحظہ کیجیے ۔ پہلے اس اُصُولی مسئلے کو پیشِ نظر رکھیے :۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ	اے ایمان والو ! بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبیؐ کی آواز سے اور آپ کے سامنے بھی

وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ (پ ۲۶: حجرات)	اِس قدر آواز بلند نہ کیا کرو۔ جیسے کہ ایک دوسرے کے سامنے کرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

یعنی حضورؐ کی مجلس میں یا آپ کے سامنے اس طرح آواز نہ نکالو، جیسے کہ آپس میں ایک دوسرے سے چہک کر یا تڑخ کر بات کرتے ہو، آپ کے سامنے دبی آواز سے بات کرنا چاہیے۔ مبادا بے ادبی ہو جائے اور تمام اعمال ضائع ہو جائیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی۔ (حجرات)	جو لوگ آں حضرتؐ کے پاس دبی آواز سے بولتے ہیں، وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کا اللہ تعالیٰ نے ادب کے لیے امتحان کر لیا ہے۔

اکابر اہلِ سنت اور جمہور مفسرین کا اجماع ہے کہ ورودِ وفات کے بعد بھی حکمِ قرآنی روضۂ اطہر کے پاس کامل ادب و احترام محفوظ رکھنے کا متقاضی ہے۔ مسجدِ نبویؐ کی حدود میں شرعی ضروریات کے علاوہ آواز ہمیشہ پست رہے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں:۔

"قبرِ شریف کے پاس حاضر ہو، وہاں بھی ان آداب کو محفوظ رکھے۔" (فوائد القرآن ۶۹۹)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ فرماتے ہیں:۔

"آں حضرتؐ حیات ہیں۔ لہٰذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہیے۔ مسجدِ نبویؐ کی حدود میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے، اس کو حضرتؐ خود سنتے ہیں۔" (تذکرۃ الخلیل ۲۰۶)

قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"بہت پکار کر نہ بولے، بلکہ آہستہ خضوع اور ادب سے بہ نرمی عرض کرے اور جس کا سلام کہنا ہو، عرض کرے یا رسول اللّٰہ من فلان بن فلان یستشفع بك الی ربك"۔ (زبدۃ المناسك، ص۱۹۱، ادارہ اشرفیہ، لاہور)

حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا اعتقاد

"عن السائب بن یزید قال کنت قائمًا فی المسجد فحصبنی رجل فنظرتُ الیه فاذا عمر بن الخطاب فقال اذهب فائتنی بهذین فجئتُهُ بهما فقال ممن انتما او من این انتما قال من اهل الطائف قال لو کنتما من اهل البلد لأوجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم"۔ (صحیح بخاری جلد ۱ ص۶۷ دہلی)

ترجمہ:- "سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں مسجد میں کھڑا تھا کہ کسی شخص نے میرے کنکری ماری کیا دیکھتا ہوں کہ وہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نے فرمایا "جاؤ۔ ان دونوں شخصوں کو میرے پاس لے آؤ" میں انھیں آپ رضی اللہ عنہ کے پاس لے آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا "تم کن لوگوں میں سے ہو یا تم کہاں کے ہو"؟ انھوں نے کہا "ہم اہلِ طائف میں سے ہیں"۔ اس پر حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

"اگر تم اہلِ مدینہ میں سے ہوتے، تو میں تمھیں سزا دیتا۔ اس لیے کہ تم مسجدِ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم میں (جس کے سامنے آپ کا روضۂ منورہ ہے) اپنی آوازیں بلند کر رہے ہو"۔

آواز بلند کرنے پر مسجدِ رسول اللّٰہ کی نسبت سے نکیر کرنا اسی لیے تھا کہ وہاں آپ کا روضۂ اطہر ہے۔ جس طرح آپ کی اس دنیوی زندگی میں آپ کے پاس آواز بلند کرنا جرم تھا، اسی طرح آپ کے روضۂ منورہ کے پاس آواز بلند کرنا بھی جائز نہیں، اس لیے کہ آپ وہاں تشریف فرما ہیں اور

جسدِ عنصری سے زندہ ہیں، حدودِ مسجد کی آواز کو بلا کسی توسط کے خود سنتے ہیں۔

یہ گمان نہ کیا جائے کہ اس نکیر کا منشا یہ "اصل" ہے کہ مسجد میں آوازیں بلند کرنا جائز نہیں، پھر جس شان اور مقام کی یہ مسجد ہوگی، اسی درجے کا یہ حکم ہوگا کہ اس میں آواز بلند نہ کی جائے اور اس کی خلاف ورزی اسی درجہ کا جرم قرار پائے گی۔ اس لیے کہ سلف و خلف میں سے کسی نے اس اصل کو منشائے نکیر نہیں فرمایا: ثانیاً علمائے ثقات اور ائمۂ سلف ہمیشہ اس روایت کو ان آداب میں ذکر کرتے آئے ہیں، جو حضور کی مجلس میں حاضری سے متعلق ہیں۔ کما نقل عن مالک الامام وغیرہ من الائمۃ الاعلام؛ ثالثاً اس صورت میں مسجد کی رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم، کی طرف نسبت محض تشریفِ مسجد کے لیے ہوگی، حکم نکیر براہِ راست اس اضافت سے متعلق نہ ہوگا، حالاں کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نکیر ہی ان الفاظ سے فرما رہے ہیں۔ پس اس میں تاویلِ مذکور یقیناً "صرف عن الظاہر" ہوگی اور ظاہر ہے کہ جب کلام اپنے اصل پر محمول ہو سکے، تو وہاں "صرف عن الظاہر" درست نہیں ہوتا؛ رابعاً حضرتِ فاروقِ اعظمؓ نے اس نکیر پر دلیل پیش نہیں فرمائی، بلکہ اس اضافت ہی کو دلیل کے انداز میں بیان فرمایا ہے: اگر محض احترامِ مسجد ہی مقصود ہوتا، تو اس پر دلیل بھی بیان فرما دی ہوتی۔ اسلیے کہ یہ مسئلہ اس سطح پر بھی نظری ہی تھا، ہاں احترامِ دربارِ رسالت نصِ قرآن اور واضح تعامل کے پیشِ نظر ضرور یہ درجہ اختیار کر چکا تھا کہ اسے معرضِ دلیل میں لائے بغیر ہی منشائے نکیر کے طور پر بیان کیا جا سکے؛ خامساً محض احترامِ مسجد کو نظر انداز کرنا قابلِ اخراج عن المسجد تو ہو سکتا ہے (فعلہ عبد اللہ بن مسعودؓ کما رواہ الدارمی فی سننہ)، لیکن اسے قابلِ سزا قرار دینے کا قول سلف میں سے کسی نے نہیں کیا؛ ہاں آدابِ رسالتؐ کو نظر انداز کرنا اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ضرور قابلِ سزا رہا ہے اور یہاں ایجاع کا ذکر ہے، اخراج کا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب!

اگر حضرتِ عمرِ فاروقؓ کے اعتقاد میں حضورؐ اپنی قبرِ مبارک میں زندہ نہ ہوتے اور قریب کی آوازوں کو خود نہ سُن رہے ہوتے، تو حضرتِ فاروقِ اعظمؓ حضورِ اکرمؐ کے پاس دبی آواز سے بات کرنے کے قرآنی حکم کو اس انداز میں کبھی نہ بیان فرماتے۔ حدودِ مسجد تک بلند آواز نکالنے کو قابلِ سزا قرار دینا اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ حضرت عمرِ فاروقؓ آں حضرتؐ کو اپنے روضۂ اطہر میں فائز الحیات، زندہ اور مدرک الاصوات سمجھتے تھے۔ پیشِ نظر رہے کہ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے اور اس کی صحت اور تقریب ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے۔

تائیدِ مزید

قد روی عن ابی بکر الصدیقؓ قال لا ینبغی رفع الصوت علی نبی حیًّا ولا میتًا وروی عن عائشةؓ انها کانت تسمع صوت الوتد یوتد والمسمار یضرب فی بعض الدور المطنبة بمسجد رسول اللہ ﷺ فترسل الیهم لا توذوا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قالوا وما عمل علی بن ابی طالبؓ مصراعی دارہ الا بالمناصع[1]

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آواز بلند کرنا جائز نہیں۔ نہ وفات سے پہلے، نہ وفات کے بعد۔ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ جب کبھی اُن گھروں میں جو مسجدِ نبوی سے متصل تھے، کسی میخ لگنے یا کیل لگنے کی آواز سنتی تھیں، تو یہ حکم بھیجی تھیں کہ (خبردار!) حضورؐ کو (اس آواز سے) اذیت نہ دو اور حضرت علیؓ نے اسی سے بچنے کے لیے اپنے گھر کے کواڑ باہر جاکر بنوائے تھے (تاکہ ان کے بننے کا شور حضورؐ کو اذیت نہ

---

[1] المناصع الخ - یتخلی فیها للبول او قضاء الحاجة والواحد منصع - قمر

توفيًا لذالك محكن ارداك الحسيني في اخبار المدينة وهذا امما يدل على انهم كانوا يرون انه حيٌّ ـ

(شفاء السقام ص۱۴۳ مصر)

ـ)۔ ان تمام روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آں حضرت کو اپنے روضۂ اطہر میں زندہ یقین کرتے تھے ۔

حضرتِ عمرِ فاروقؓ جب کسی مُہم سے فارغ ہو کر واپس مدینہ آتے، تو سب سے پہلا کام، جو آپؓ کرتے، وُہ آں حضرتؐ کے حضُور میں سلام عرض کرنا ہوتا تھا اور اسی کی آپؓ دُوسروں کو تلقین فرماتے تھے۔

"اوّل کارے کہ عمرؓ ابتدا کرد سلام پیغمبر بود، صلی اللہ علیہ وسلّم"۔

(جذب القلوب ص۲۰)

حضرتِ عثمانؓ کا اعتقاد

امیرالمؤمنین سیدنا حضرتِ عثمانؓ کا جب باغیوں نے محاصرہ کر لیا تو بعض صحابہؓ نے عرض کی کہ بہتر یہ ہے کہ آپ شام چلے جائیں، وہاں کی افواج مضبوط ہیں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے ارشاد فرمایا:۔

"رما نخوارم کہ از دار الہجرت خود مفارقت کنم و مجاورتِ رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم بگذارم"۔

(جذب القلوب ص۱۸۸)

مَیں اسے جائز نہیں سمجھتا کہ اپنے دار الہجرت کو چھوڑ جاؤں اور (یہ بھی مناسب نہیں سمجھتا کہ) حضُورؐ کی ہمسائگی چھوڑ دوں۔

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؓ حضُورِ اکرمؐ کو اپنے روضۂ اطہر میں زندہ یقین کرتے تھے۔ اگر وہاں جسدِ اطہر محض بے حس و بے شعُور پڑا ہوتا اور رُوح اس سے بالکل جُدا ہوتی،

تو پھر اس قرب کا آخر کیا فائدہ تھا۔ خاہر ہے کہ ایسا قرب کسی لذت کا سامان نہیں ہو سکتا۔ چہ جائے کہ اس پر جان قربان کر دی جائے۔ حضرتِ عثمانؓ شام نہ گئے اور مجاورتِ رسولؐ میں وہ لذت اُٹھائی کہ اس پر جان قربان کر دی ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خُدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرتِ علی مرتضیٰؓ کا اعتقاد

حضرت علیؓ فرماتے ہیں :-

من زار قبر رسول اللّٰہ ﷺ کان فی جوار رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ (جذب القلوب ص۱۸۰)

جو حضورؐ کے روضۂ اطہر کے پاس حاضر ہو وہ اس وقت حضورؐ کی ہمسائگی میں ہوتا ہے۔

اگر حضورِ انورؐ کی رُوحِ اقدس آپ کے جسدِ اطہر سے مفارق اور بالکل بے تعلق ہوتی تو سیدنا حضرت علیؓ اس خصوصیت کے ساتھ قربِ روضۂ مطہرہ کو ہمسائگی رسولؐ ہرگز قرار نہ دیتے۔ آپؓ کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ آپؓ بھی حضرت عثمانؓ کی طرح حضورِ اکرمؐ کو اپنے روضۂ اطہر میں زندہ یقین کرتے تھے۔

حضرتِ تھانویؒ نے فرمایا :-

"مدینۂ منورہ جانے والا یہ نہ کہے کہ میں نے حضورِ انورؐ کی قبر کی زیارت کی، بلکہ یُوں کہے کہ میں نے حضورؐ کی زیارت کی، کیوں کہ حضورؐ زندہ ہیں"۔

(وعظ التبلیغ ص۳۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ)

عُلمائے کرام نے حضرت علیؓ کے اس عمل کی علت اسی حقیقت کو قرار دیا ہے :-

اذ ھو حی فی قبرہ یصلی فیہ (زرقانی جلد۵ ص۲۰۲)

"حضرت علیؓ کے اس عمل کی بنا یہی تھی کہ حضورؐ اپنے روضۂ اطہر میں زندہ ہیں"۔

وماعمل علی بن ابی طالبؓ مصراعی داره الا بالمناصع[1] توقیا لذالك۔ (شفاء السقام ص۱۶۳ مصر)

حضرت علی مرتضیٰ نے اپنے گھر کے دروازے مدینہ میں ایک باہر کی جگہ میں بنوائے تاکہ کواڑ بننے کا کہیں شور پیدا نہ ہو اور حضورؐ کو اذیت نہ ہو۔

علاوہ ازیں حافظ ابو عبداللہ "مصباح الظلام" میں حضرت علی مرتضیٰؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی حضورِ انورؐ کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوا اور عرض کی :-

"یا رسول اللہؐ! آپ نے جو پروردگار سے سنا، ہم نے آپ سے سن لیا اور جو کچھ آپ نے خدا سے یاد کیا، ہم نے آپ سے یاد کر لیا۔ آپ پر جو آیات نازل ہوئیں اُن میں یہ آیت شریفہ بھی ہے :-

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ (پ۵ نساء)

اور ان لوگوں نے جب اپنے آپ پر ظلم کیا تو اگر آتے آپ کے پاس اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتے اور یہ رسول بھی ان کے لیے دعائے معافی کرتے، تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

روضۂ منورہ سے آواز آئی :-

"اللہ تعالیٰ نے تجھے بخش دیا ہے"۔ (جذب القلوب فارسی ص۱۹۶)

حضرت علی مرتضیٰؓ کی یہی روایت علامہ ابو حیان اندلسیؒ البحر المحیط جلد ۳ ص۲۸۳ مصر ۲۷۵ میں، علامہ سمہودیؒ وفاء الوفاء میں (خلاصۃ الوفاء ص۵۳ مصر) اور علامہ قرطبیؒ اپنی تفسیر جلد ۵

---

[1] محل بالمدینۃ کان متبرز النساء لیلا قبل اتخاذ الکنف وھی ناحیۃ بئر ابی ایوب۔ (زرقانی جلد۸ ص۳۰۳ مصر)

میں نقل فرماتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا یہ مشاہدہ اور پھر اس پر کسی قسم کی نکیر نہ کرنا اور نہ اس کی کوئی توجیہ کرنا ان کے اس عقیدے کی تائید کرتا ہے کہ:۔

"جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے آیا وہ اس وقت حضور اکرمؐ کی ہمسائگی میں ہے"۔ (جذب القلوب ص۱۸۰)

یاد رہے کہ اعرابی کا مذکورہ بالا واقعہ ہم نے صرف تائیداً نقل کیا ہے۔ پس اسناد کا متصل نہ ہونا اور روایت میں کلام ہونا مضر نہ سمجھا جائے، اس لیے کہ استدلال مقصود نہیں، صرف استشہاد پیش نظر ہے۔

تنبیہ

اعرابی کی یہ روایت اپنی جگہ تسلیم ہو یا نہ، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ آیت مذکورہ میں "جاءوک" (اگر وہ گناہگار آپ کے پاس حاضر ہوتے) کا مطلب آں حضرتؐ کی یہاں کی دنیوی زندگی تک بالکل محدود نہیں سمجھا گیا، بلکہ آں حضرتؐ کو وفات شریفہ کے بعد بھی حیات حقیقی اور سماع حقیقی حاصل ہے، اور ان کے حضورؐ میں پھر دعائے استغفار کے لیے عرض کیا جا سکتا ہے۔ محدثینؒ اور مفسرینؒ کا اس آیت شریفہ کے تحت ایسے واقعات نقل کرنا اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ "جاءوک" کا مطلب ہرگز اس دنیا کی زندگی تک محدود نہیں، بلکہ اب بھی آپ کے روضۂ اقدس پہ حاضر ہو کر دعائے مغفرت کے لیے عرض کیا جا سکتا ہے:۔

وراجع له شرح المسلك المقسط للملا علی القاری ص۲۸۱ مصر

وشرح الشفاء للعلامة الخفاجی المصری جلد ۳ ص۳۹۸

والزرقانی جلد ۸ ص۲۹۹، ص۳۰ مصر۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"فقہاءؒ نے بعد سلام کے وقت زیارت قبرِ مبارک کے شفاعتِ مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے۔ پس یہ جواز کے واسطے کافی ہے۔" (فتاوٰے رشیدیہ جلد ۱ صـ۱)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی اس آیتِ شریفہ میں "جاءُوک" (اگر گنہگار آپ کے پاس حاضر ہوں) کو عام رکھا ہے، فرماتے ہیں :-

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا - کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص ہو تو کیونکر ہو۔ آپ کا وجود باجود تربیتِ تمام اُمت کے لیے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے اُمتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا، جب ہی متصور ہے کہ آپ قبر میں زندہ ہوں۔" (آب حیات صـ۴۹)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں :-

"مواہب میں بسندِ امام ابو المنصور صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزیؒ نے محمد بن حرب ہلال سے روایت کیا ہے کہ میں قبرِ مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسلؐ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی، جس میں ارشاد فرمایا: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا — میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلے سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں۔ اور پھر دو شعر پڑھے .... ان محمد بن حرب کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی ہے۔ اھ غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اُس وقت

۱؎ فتح القدیر جلد ۲ صـ۳۳۶ مصر میں ہے ثم یسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم الشفاعۃ فیقول یا رسول اللہ اسألک الشفاعۃ یا رسول اللہ اسألک الشفاعۃ واتوسل بک الی اللہ فی ان اموت مسلمًا علی ملتک وسنتک ویذکر کل ما کان من قبیل الاستعطاف والرفق ...... انتہی قلت وکذالک فی الطحطاوی علی مراقی الفلاح فراجع لہ تجدہ کافیاً فی کل باب شافیاً من کل ارتیاب واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

نکیر منقول نہیں، پس حجت ہوگیا۔" (نشر الطیب ص ۲۱۹)

فثبت ان حکم الایۃ باق بعد وفاتہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	ثابت ہو چکا ہے کہ اس آیت کا حکم حضورؐ کی وفاتِ شریفہ کے بعد بھی باقی ہے۔

(اعلاء السنن جلد ۱۰ ص ۳۳/۳۲۹)

یہ تحقیق اپنے مقام پر ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت کا حکم حضورؐ کی وفاتِ شریفہ کے بعد بھی باقی ہے۔

اعرابی کی حکایتِ مذکورہ حافظ ابنِ کثیرؒ اپنی تفسیر (جلد ۳ ص ۱۳۲ مصر) میں، شیخ ابو المنصور صباغؒ کی روایت سے نقل فرماتے ہیں اور یہی واقعہ تفسیر مدارک (جلد ا ص ۳۹۹ مطبوعہ مصر) میں بھی موجود ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں :۔

جمیع اربابِ مذاہبِ اربعہ کہ تصنیفِ مناسکِ حج کردہ اند، ایں حکایت را آوردہ و استحسان نمودہ و بسیارے از ائمۂ اعلام باسانیدے کہ دارند روایت آں کردہ۔	چاروں مذہبوں کے علماء نے، جنھوں نے مناسکِ حج پر تصنیفات کی ہیں، اس حکایت کو بیان کیا ہے، اس کی تحسین کی ہے اور بڑے بڑے ائمہ نے اسے اپنی اپنی سندوں سے روایت کیا ہے۔

(جذب القلوب ص ۱۹۵)

ممکن ہے محمد بن حرب کی یہی روایت دراصل حضرت علی مرتضیٰؓ سے منقول ہو اختصار کے باعث محمد بن حرب سے اوپر کی سند حذف ہو گئی ہو اور "اعتماد علی محمد بن حرب" کے سبب اس کا ذکر ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ ہم نے اس روایت کو صرف تائیدِ مفہوم اور آیتِ شریفہ کے بیانِ عموم کے لیے نقل کیا ہے، مستقل استدلال مقصود نظر نہیں۔

تتمة الفصل

بیانِ عقیدہ از عائشہ صدیقہ رضہ

علامہ سبکیؒ نقل فرماتے ہیں:-

روی عن عائشة انها كانت تسمع صوت الوتد يوتد و المسمار يضرب فى بعض الدور المطنبة بمسجد رسول الله ﷺ فترسل اليهم لا تؤذوا رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ (شفاء السقام ص۱۲۳)

حضرت عائشہ رضہ جب کبھی ان گھروں سے جو مسجدِ نبویؐ سے متصل تھے، کسی میخ یا کیل لگائے جانے کی آواز سنتی تھیں تو یہ حکم بھیجتی تھیں کہ (خبردار!) حضورؐ کو (اس آواز سے) اذیت نہ دو۔

وكذالك فى شرح السلامة الزرقانی جلد ۸ ص۳۰۴ مصر

عن عائشة رضہ قالت كنت ادخل بيتى الذى فيه رسول الله صلى الله عليه وسلم وانى واضع ثوبى واقول انما هو زوجى وابى فلما دفن عمر معهم فوالله ما دخلت الا وانا مشدودة على ثيابى حياء من عمر رضہ رواه احمد۔ (كذا فى المشكوٰة ص۱۵۴)

حضرت عائشہ رضہ کہتی ہیں کہ میں اپنے حجرے میں جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، چادر کھلے داخل ہو جایا کرتی تھی، مجھے یہی خیال ہوتا تھا کہ میرے خاوند اور میرے والد ہی تو یہاں ہیں۔ جب حضرت عمر رضہ وہاں دفن ہوئے تو خدا کی قسم، میں وہاں پردے ہی سے جاتی تھی اور یہ حضرت عمر رضہ سے حیا کے باعث تھا۔

رجال اسناد احمد رجال صحیح (تنقیح الرواۃ جلد۴ ص۳۴۲ مطبع انصاری)

دیکھیے، حضرت عائشہؓ یوں نہیں کہہ رہی ہیں کہ میں اس حجرے میں داخل ہوتی تھی، جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدنِ میت مدفون تھا۔ بلکہ یوں فرما رہی ہیں: "جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے"۔

نبوت و رسالت کے لیے ادراک و شعور لازم ہے۔ اگر ذاتِ مدفون محض بے حس و بے شعور ہو تو پھر اُسے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی نہیں کہا جا سکتا اور اگر کہنا ہی ہو، تو حکمی طور پر کہنے سے چارہ نہیں، حقیقی اعتبار سے بے حس و بے شعور ذاتِ مدفون کو ہرگز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے کی گنجائش نہیں؛ فقط رُوحِ اقدس کے لیے تو لفظ "رسول اللہ" کے اطلاق کے لیے تاویل ہو سکتی ہے۔ رُوحِ اقدس اور جسمِ اطہر کے مجموعہ پر بھی یہ اطلاق بلا ریب صحیح ہے، لیکن فقط بدن، جس میں ادراک و شعور دونوں منتفی ہوں اس پر حقیقی اعتبار سے اطلاقِ رسول قطعاً محال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ام المومنینؓ، حضورِ انورؐ کو آپ کے روضۂ اقدس میں زندہ یقین کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کا سماعِ موتٰی سے انکار مشہور ہے۔ مگر یہاں نہ صرف اس کا استثنا ہے، بلکہ رویتِ بصری بھی ثابت کی جا رہی ہے۔ ہاں پردے کی چادر کا چونکہ مقصودِ وجود ہی ستر و حجاب اور پردے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی کثافت باقی رہنے دی جاتی تھی۔ تاکہ جس طرح قبورِ شریفہ کی پاک مٹی سے یہ انکشافات جاری ہیں۔ پردے کی چادر سے ایسا نہ ہو اور اس کا مقصودِ وجود باطل ہو کر نہ رہ جائے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک کسی چیز کو قائم رکھتے ہیں، اس کا مقصودِ وجود ضائع نہیں فرماتے۔ ہاں ضمنی حالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ قبر کا مقصودِ وجود ذاتِ مدفون کو عامۃ الناس سے پردے میں کرنا ہوتا ہے، عامۃ الناس کو ذاتِ مدفون سے پردے میں لانا نہیں ہوتا۔ ایسا اگر ہو تو ضمناً ہوتا ہے۔ پس اگر ذاتِ مدفون کو پردۂ قبر میں سے باہر کا انکشاف ہو رہا ہو اور باہر والے اسے عادۃً نہ دیکھ سکیں تو اس سے مقصودِ وجود باطل نہیں

نہیں ہوتا اور پردہ چادر کا چونکہ مقصودِ وجود ہی اوڑھنے والے کو پردے میں لانا ہے۔ اس لیے انکشاف کی حدود اگر اس کے پار نہ ہو سکیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

حاشیہ مشکوٰۃ میں اس حدیث عائشہؓ پر یوں لکھا ہے:-

اوضح دلیل علیٰ حیات المیت وعلیٰ انه ینبغی احترام القبور عند زیارته مهما امکن لاسیما الصالحون بان یکون فی غایة الحیاء والتادب بظاهره باطنه۔

(ص۱۵۴)

یہ حدیث حیاتِ میت پر بہت واضح دلیل ہے اور اس پر کہ قبورِ شریفہ کا احترام جہاں تک ممکن ہو سکے کیا جائے، خاص طور پر صالحین کی قبور کے سامنے بہت ادب و حیاء ملحوظ رہے۔

حضرتِ صدیقہؓ کے اس تعامل سے نہ صرف آں حضرتؐ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کے حواس کے روشن ہونے کا پتہ چلتا ہے، بلکہ حضرتِ صدیقِ اکبرؓ اور حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کی حیاتِ اقدس اور ان کے حواس کے روشن ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

ولید بن عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں جبکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ والیِ مدینہ تھے، تو ایک دفعہ آں حضرتؐ کے روضۂ اقدس کی دیوار خستگی کی وجہ سے کچھ کھل گئی تو ایک قدم نظر آیا۔ لوگ بہت گھبرائے۔ یہاں تک کہ:-

جاء سالم بن عبد اللہ بن عمر بن الخطابؓ وعرف الناس انها قدم جدہ عمر بن الخطابؓ۔

(مختصر تذکرہ قرطبی ص۲۸)

حضرتِ عمرؓ کے پوتے سالمؓ آئے اور انھوں نے پہچان کی کہ یہ ان کے دادا سیدنا حضرتِ عمرؓ کا قدمِ مبارک تھا۔

انبیاء کے علاوہ بعض دوسرے مقربین کے اجساد کا بھی محفوظ ہونا

حیاتِ قبریہ اور اس کے ادراکات

۱۔ جب امیر معاویہؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں مدینۂ منورہ میں ایک نئی نہر کھدوانے کا حکم دیا تو اس کی گزرگاہ میں اتفاق سے قبرستانِ اُحد آتا تھا۔ آپؓ نے حکم دیا کہ ان مدفونین کو یہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ دفن کر دیا جائے۔ جب قبریں کھولی گئیں تو شہدائے اُحد اپنی اصلی حالت پر بالکل تر و تازہ تھے۔ کھودتے ہوئے اتفاق سے ایک کدال حضرت حمزہؓ کے پاؤں کے قریب جا لگی اسی وقت خون جاری ہو گیا۔ یہ واقعہ جنگِ اُحد سے قریباً ۵۰ سال بعد کا ہے۔

۲۔ بیہقیؒ نے روایت کیا ہے کہ فاطمہ بنت خزاعیہ نے حضرتِ حمزہؓ کی قبر پر سلام کیا:۔

"السلام علیك یا عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

وہاں سے جواب آیا:۔

"علینا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ"

۳۔ حضرت عمرو بن جموح انصاریؓ بھی شہدائے اُحد ہی سے تھے۔ جب سیلاب نے ان کی قبروں کو کھول ڈالا، تو یُوں معلوم ہوتا تھا، گویا کہ کل دفن کیے گئے ہیں۔ جنگِ اُحد اور اس واقعۂ سیلاب کے مابین ۴۶ سال کا فرق تھا۔

فوجدا لم یتغیرا کانھما ماتا بالامس وکان احدھما قد جرح فوضع یدہ علی جرحہ	پس ان دونوں کو اس طرح پایا گیا گویا کہ وہ ابھی کل ہی فوت ہوئے ہیں۔ دونوں میں سے ایک کو ایسا زخم لگا تھا کہ انھوں نے اپنا

فدفن وهو كذلك فاميطت يده عن جرحه ثم ارسلت فرجعت كما كانت۔

(موطا امام مالکؒ ص۱۷۷)

ہاتھ اس پر رکھا تھا اور اسی طرح انھیں دفن کر دیا گیا تھا۔ پس جب ان کا ہاتھ اس زخم سے ہٹایا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا، تو وہ وہیں آگیا، جہاں کہ تھا۔

۴۔ حضرت حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ بن جابرؓ کے مزارات دریائے دجلہ کے کنارے تھے۔ پندرہ بیس برس کا عرصہ گزرتا ہے کہ دریا زمین کاٹتا ہوا ان مزارات مقدسہ تک پہنچنے لگا۔ حکومت عراق نے حکم دیا کہ ان مزارات شریفہ کو یہاں سے حضرت سلمان فارسیؓ کے احاطہ میں منتقل کر دو؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آٹھ دس ہزار آدمیوں کے قریب ان جنازوں میں شامل ہوئے۔ ان شاملین میں سے ایک صاحب سید العطاف حسین بیان کرتے ہیں:۔

"قبر سے نکلے ہوئے جنازوں کی موجودگی اور خلق کی آہ و بکا نے قیامت کا نمونہ برپا کر دیا تھا۔ اکثر آدمی روتے روتے بیہوش ہو گئے۔ نعشیں تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی بالکل سالم تھیں، کفن ہاتھ لگنے سے بوسیدہ تھا۔ ایک صاحب کی داڑھی سفید تھی اور ایک کی سیاہ"۔ (صدق لکھنؤ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۴ء)

ورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشهداء انهم احياء يرزقون وان الحياة فيهم متعلقة بالجسد۔

(نیل الاوطار جلد ۳ ص۲۱۱)

شہدائے کرام کے حق میں نص قرآنی وارد ہے کہ وہ زندہ ہیں اور انھیں رزق بھی ملتا ہے اور یہ کہ ان کی حیات جسمانی ہے۔ (خواہ ہمارے ادراک سے بالا ہی کیوں نہ ہو)۔

شہدائے کرام کی قبور کھلنے پر اگر ہمیں ان کے حرکت و عمل پر اطلاع نہیں ہوتی اور ہم انھیں عبادت کرتا ہوا محسوس نہیں کر سکتے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری آنکھوں میں وہ قوت نہیں کہ ہمیں ان کے مصروف بالعبادت ہونے کا ادراک ہو سکے، یہ نہیں کہ وہ ذوات مدفونہ ہی معطل عن الافعال ہیں۔ پردۂ برزخ اس ادراک لطیف میں حائل ہوتا ہے۔ ہاں، اللہ

تعالیٰ جب کسی کے لیے اس عالم سے پردہ اٹھا دیں، تو وہ اس عالم میں ہوتے ہوئے بھی اس عالم کے بہت سے حالات مشاہدہ کر لیتے ہیں۔

سیدنا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تعامل

حدثنا ابو معاویۃ عن عبید اللہ عن نافع عن ابن عمرؓ انہ کان اراد ان یخرج دخل المسجد فصلی ثم اتی قبر النبی ﷺ فقال السلام علیک یا رسول اللہ، السلام علیک یا ابا بکر، السلام علیک یا ابتاہ ثم یاخذ وجھہ، وکان اذا قدم من سفر یفعل ذالک قبل ان یدخل منزلہ۔

حضرت ابن عمرؓ جب کبھی سفر پر روانہ ہوتے تو مسجدِ نبوی میں آتے، نماز پڑھتے اور پھر روضۂ انور پر حاضر ہوتے اور اَلسَّلامُ علیک یا رسُولَ اللہ! یا ابا بکر! اور السّلامُ علیک اے ابّا جان! پڑھتے اور پھر اپنے مُنہ کو تھام لیتے اور جب سفر سے واپس ہوتے، تو اپنے گھر جانے سے پہلے پھر اُسی طرح صلوٰۃ وسلام عرض کرتے۔

(المصنف لابن ابی شیبۃ الجزء الرابع ص۳۸۱ ہند)

اخرجہ عبدالرزاق ایضاً بسند صحیح۔ (وفاء الوفاء للسمہودی جلد۲ ص۴۱۰)

عبدالرحمٰن باسناد صحیح می آرد کہ ابن عمر چوں از سفر قدم می آرد اوّل بقبر شریف می رسید وی گفت السّلامُ علیکَ یا رسولَ اللہ! (جذب القلوب ص۲۰۰)

وراجع لہ الموطا للامام محمدؒ ص۳۹۶

عن نافع کان ابن عمرؓ یسلم علی القبر رایتہ، فی الیوم مائۃ مرۃ واکثر یجیء الی القبر

حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کو میں نے دیکھا وہ روضۂ اطہر پر سلام عرض کرتے تھے۔ میں نے ایک ایک دن میں انھیں

فیقول السلام علیك (منتہی المقال ص۳۳ للمفتی صدرالدین) — سو سو دفعہ، بلکہ اس سے بھی زائد بار قبر شریف پر آنے اور "السلام علیک یا رسول اللہ" پڑھتے دیکھا۔

حضرت مولینا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے بھی یہی صیغے سلام کے لکھے ہیں۔۔

"السلام علیك یا رسول اللہ۔ السلام علیك یا خیر خلق اللہ۔ السلام علیك، یا حبیب اللہ!" (زبدۃ المناسك ص۹۰ مطبوعہ لاہور)

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام، بھی نزول فرمانے کے بعد روضۂ اطہر پر حاضری دیں گے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا :۔

ولیاتین قبری حتی یسلم علی ولاردن علیہ رواہ الحاکم وصححہ۔ (در منثور جلد۲ ص۲۴۲) — حضرت عیسیٰؑ ضرور میری قبر پر بھی آئیں گے، اور سلام کہیں گے اور میں بھی اس کا جواب دوں گا۔

تنبیہ

روایات سابقہ میں صرف سلام عرض کرنے ہی کا صیغہ ملتا ہے :

السلام علیك یا رسول اللہ ـــــ وغیر ذالك

البتہ شرح شرعۃ الاسلام میں جو ترکی احناف کے ہاں بہت بڑا علمی اور تحقیقی فقہی سرمایہ ہے، یوں بھی مرقوم ہے :۔

یقول الصلوٰۃ والسلام علیك یا رسول اللہ۔

(شرح شرعۃ الاسلام ص۶۱ مطبوعہ استنبول)

روضۂ اطہر کے پاس ان صیغوں سے صلوٰۃ وسلام عرض کرنا اسی لیے ہے کہ حضورؐ حدودِ مسجد کے قرب میں خود سماعت فرماتے ہیں۔ پس اس طرز ادا سے کسی غلط عقیدے

کا ایہام نہیں ہوتا۔ اگر حضورؐ روضۂ مطہرہ پر بھی خود نہیں سنتے، تو پھر ان صیغوں سے صلوٰۃ وسلام عرض کرنا غلط عقائد کا ایہام پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس باب میں ہمارے ائمۂ کرامؒ الفاظ موہمہ سے احتراز کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ صلوٰۃ وسلام کی مختلف کیفیات صرف اسی صورت میں لائق قبول ہیں کہ کسی طرح کے غلط عقیدے کا ایہام پیدا نہ ہوتا ہو۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:۔

قد اختار جماعة من العلماء كيفيات في الصلوٰة۔ ومقتضى كلام ائمتنا المنع من ذالك الا فيما ورد عنه صلى الله عليه وسلم على ما اختاره الفقيه۔ (رد المختار جلد ۵ ص ۳۴۹)	علما کے ایک طبقے نے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے باب میں مختلف کیفیات جائز قرار دی ہیں۔ ہمارے ائمۂ احناف کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ ماسوائے ماثورہ صیغوں کے باقی تمام الفاظ موہمہ سے پرہیز کیا جائے، جیسا کہ فقیہ نے فیصلہ فرمایا ہے۔

پس اگر حضورؐ اپنے روضۂ اقدس کے قریب عرض کیے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود نہ سنتے ہوتے تو پھر ان صیغوں سے صلوٰۃ وسلام عرض کرنا غلط عقائد کا ایہام پیدا کرنے کی وجہ سے ہرگز جائز نہ ہوتا، اور اگر جائز ہوتا تو پھر قریب وبعید ہر جگہ سے جائز ہوتا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ عمل ہر جگہ پر توارث تعامل کے طور پر موجود ہوتا۔

یہ گمان نہ کیا جائے کہ پھر عامۃ المسلمین کی قبروں کے پاس صیغۂ خطاب سے سلام کہنے کی کیا توجیہ ہوگی۔ اس لیے کہ وہاں خطاب جمع اور جنس مومنین کو ہے کسی معین کو نہیں، اور یہاں ایک ذات معین کو اس صیغۂ خطاب سے مخاطب کیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معین مخاطبین سے خطاب مجاز کے جتنے پہلو اپنی لپیٹ میں لیے ہوتا ہے، معین فرد واحد کو خطاب کرنے میں اس کی اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔ فافہم وتفکر؛

حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ

عن داؤد بن صالح قال اقبل مروان یوماً فوجد رجلاً واضعًا وجهه علی القبر فاخذ برقبته وقال اتدری ما تصنع قال نعم فاقبل علیه فاذا هو ابو ایوب الانصاری رضؓ فقال جئت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم ات الحجر سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تبکوا علی الدین اذا ولیه اھله ولکن ابکوا علیه اذا ولیه غیر اھله۔

ایک دن مروان آیا اور اُس نے ایک شخص کو روضۂ انور پر مُنہ رکھے ہُوئے دیکھا۔ اُس نے اُسے گردن سے پکڑ کر ہٹایا اور کہا "جانتا ہے کہ تُو کیا کر رہا ہے؟" اُس نے کہا "ہاں"۔ وہ اُس کی طرف متوجہ ہُوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ ہیں۔ آپ رضؓ نے فرمایا "میں رسول اللہؐ کے پاس آیا ہُوں، پتھروں کے پاس نہیں آیا۔ مَیں نے حضورؐ کو فرماتے سُنا کہ اس وقت دِین پر نہ رونا جب اُس کے والی اُس کے اہل ہوں۔ بلکہ اُس وقت رونا جب کہ دِین کی ولایت غیر اہل ہاتھوں میں آجائے۔"

اخرجه الحاکم وقال صحیح الاسناد جلد ۴ ص۵۱۵ واقر علیه الذھبی فقال صحیح[1]۔

---

[1] رواہ احمد ایضاً بسند حسن قال حدثنا عبدالملک بن عمرو حدثنا کثیر بن زید عن داؤد بن ابی صالح قال ۔۔۔۔۔ الخ قال الھیثمی رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر والاوسط وفیه کثیر بن زید وثقه جماعة وضعفه النسائی (کما فی کتاب الضعفاء و المتروکین للامام النسائی) وغیرہ ورواہ یحیی بن الحسین بن جعفر الحسینی فی اخبار المدینة حدثنی عمر بن خالد حدثنا ابو نباتة عن کثیر بن زید عن المطلب بن عبداللہ قال السبکی وابو نباتة ومن فوقه ثقات وعمر بن خالد لم اعرفه قلت لا ضیر فان احمد رواہ عن عبدالملک بن عمرو وھو ثقة عن کثیر بن زید وقد حکم السبکی بتوثیقه (کذا فی وفاء الوفاء جلد ۴ ص۱۳۵۹)۔

پیش نظر رہے کہ یہ مقام فقط انھی حضرات کا ہے، جنھیں پورا انکشاف ہو رہا ہو اور وہ قبر سے نہیں، صاحبِ قبر سے مصروفِ نیاز ہوں۔ پس ان لوگوں کے لیے جو اس مقام انکشاف کے بغیر روضاتِ عالیہ یا قبورِ شریفہ سے لپٹتے ہوں یا انھیں بوسہ دیتے ہوں، اس حدیث میں کوئی دلیل اور حجت نہیں۔ ان کے لیے ایسے امور کا ارتکاب جیسا کہ فقہائے کرامؒ نے فرمایا ہے، قطعاً ناجائز ہے۔

خلاصۃ البیان

یہ کہ آں حضرتؐ کے ارشاداتِ عالیہ خلفائے راشدینؓ کے عقائدِ قدسیہ، اُمّ المومنینؓ کے عملی فیصلے اور صحابۂ کرامؓ کے نظریات یکے بعد دیگرے آپ کے سامنے آ چکے۔ ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ حضورِ انورؐ اپنے روضۂ اطہر میں فائز الحیات ہیں اور قریب عرض کیے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود سنتے ہیں۔ احادیث اربعہ اور خلفائے اربعہ کے فیصلوں کے بعد اب مسالکِ اربعہ کو بھی دیکھیے:۔

الفصل الثانی

مذاہبِ اربعہ در حیاتِ نبویہ

مالکیہ

سیدنا حضرت امام مالکؒ مدنی ہونے کے اعتبار سے اس باب میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ آپ روضۂ اطہر کے پاس ہی مسجدِ نبوی میں درسِ حدیث دیتے تھے۔

امیر المؤمنین ابو جعفر نے امام مالکؒ سے کسی مسئلے میں مسجدِ نبوی میں گفتگو کی تو امام مالکؒ نے فرمایا کہ اے امیر المؤمنین! تم کو کیا ہوا، اس مسجد میں آواز مت بلند

کرو کہ حضورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام وفات کے بعد وہی ہے، جو حالتِ حیات میں تھا، سو ابو جعفر دب گیا۔

نشر الطیب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی صفحہ ۲۱۱ مطبوعہ دیوبند

وکذالک فی وفاء الوفاء جلد ۲ صفحہ ۴۲۳ طبع مصر۔

نقل عن الامام مالک انہ کان یکرہ ان یقول رجل زرت قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ابن رشد من اتباعہ ان الکراھۃ لغلبۃ الزیارۃ فی الموتٰی وھو صلی اللہ علیہ وسلم احیاہ اللہ تعالٰی بعد موتہ حیاۃ تامۃ واستمرت تلک الحیوۃ وھی مستمرۃ فی المستقبل ولیس ھذا خاصۃ بہ صلی اللہ علیہ وسلم بل یشارکہ الانبیاء علیہم السلام فھو حی بالحیاۃ الکاملۃ مع الاستغناء عن الغذاء الحسی الدنیوی۔

امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ اسے ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ "میں نے حضورؐ کی قبر کی زیارت کی"۔ امام مالکؒ کے معتقدین میں سے ابنِ رُشد اس کی تشریح یہ کرتے ہیں کہ اس ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ زیارت کا لفظ عام طور پر موتٰی کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور حضورؐ وفاتِ شریفہ کے بعد اب حیاتِ تامہ سے زندہ ہیں اور یہ حیات آئندہ بھی اسی طرح رہے گی۔ یہ صرف آپ ہی کا خاصہ نہیں، بلکہ تمام انبیاؑ اس وصف میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ پس آپؐ غذائے حسِ دنیوی سے استغنا کے باوجود حیاتِ کاملہ سے زندہ ہیں۔

نور الایمان بزیارۃ آثار حبیب الرحمٰن صفحہ ۱۴ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی۔

(وکذالک فی وفاء الوفاء جلد ۲ صفحہ ۴۱۳، صفحہ ۴۱۴ مصر)

علمائے مالکیہ میں سے امام قرطبیؒ (جلد ۵ صفحہ ۲۶۵)، امام ابو حیان اندلسی (البحر المحیط جلد ۱ صفحہ ۲۸۳)، علامہ ابن الحاج، علامہ ابن رشد اندلسی اور ابن ابی جمرۃ وغیرہم

من اکابر نے ان مسائل کا خوب تذکرہ کیا ہے۔

شوافع

شوافع میں سے امام بیہقیؒ اور امام سیوطیؒ نے حیاتِ انبیاءؑ کے عنوان پر مستقل تصانیف سپردِ قلم کی ہیں۔ علامہ طیبیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے متعدد حوالے مباحث حدیثیہ کے ضمن میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ امام غزالیؒ اور علامہ سبکیؒ نے بھی اسی حقائق کی تصدیق فرمائی ہے۔

لطف یہ ہے کہ یہ اکابر، خواہ مالکی ہوں، خواہ شافعی، کسی مقام پر بھی اس تحقیق کو اپنے فقہی مسلک کے تحت ذکر نہیں کرتے، بلکہ جہاں کہیں اس عقیدے کا ذکر آتا ہے، وہاں اسے مسلکِ اہلِ سنت ہی کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

جمیع اکابر شافعیہؒ یہی مسلک رکھتے ہیں کہ آں حضرتؐ کو اپنے روضۂ اطہر میں جو حیات حاصل ہے وہ حیاتِ جسمانی ہے اور وہی جسدِ اطہر فائز الحیات ہے، جو اس دنیا میں تھا۔

علامہ قونویؒ (شافعی المسلک) کا تفرد اس میں تو ہے کہ وہ انبیائے کرامؑ کے استقرارِ قبر میں استمرار کے قائل نہیں، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ انبیائے کرامؑ دفن کے کچھ دن بعد اپنی قبورِ شریفہ سے اٹھالیے جاتے ہیں اور ملاء اعلیٰ میں استقرار پذیر ہوتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے انھیں بھی انکار نہیں کہ انبیائے کرامؑ کی روحیں ان کے اجساد کریمہ سے ہرگز جدا نہیں ہوتیں اور جہاں بھی انبیائے کرامؑ کے یہ دنیاوالے جسم ہوں، وہاں انھیں حیاتِ جسمانی حاصل ہوتی ہے۔ حیاتِ جسمانی پر بہر صورت اجماع قائم ہے اور علمائے شافعیہؒ کا "حیات فی القبر" پر جو اجماع ہے، وہ بھی ایک تفرد سے قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔

عندنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیّ یحس و یعلم و تعرض علیہ اعمال الامۃ و یبلغ الصلوٰۃ والسلام۔
(طبقات شافعیہ جلد ۲ صـ ۲۸۲)

ہم شافعیہ کے نزدیک حضورؐ زندہ ہیں اور آپ میں احساس و شعور موجود ہے۔ آپ پر اعمالِ امت بھی پیش ہوتے ہیں اور صلوٰۃ وسلام بھی آپ کو پہنچایا جاتا ہے۔

حنابلہ

حنابلہ میں سے حافظ ابنِ تیمیہؒ کی یہ تحقیق کہ حضورؐ اپنے روضۂ اطہر کے قریب عرض کیے گئے صلوٰۃ وسلام کو خود بلا واسطہ سُنتے ہیں۔ ان کی اپنی تحریر سے باحوالہ بتعیین صفحہ ومطبع آپ کے سامنے آچکی ہے۔ حافظ ابنِ قیمؒ کی تصریحات بھی یکے بعد دیگرے آپ ملاحظہ فرما چکے۔

قال ابن عقیل من الحنابلۃ ھو صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ یصلی۔
(الروضۃ البہیہ صـ ۱۴) ولیوین کا صافی بدائع الفوائد لابن القیم

حنابلہ کے مشہور بزرگ ابن عقیل فرماتے ہیں کہ حضورِ انورؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

حنفیۂ کرام[1]

علامہ شرنبلالیؒ نورالایضاح میں فرماتے ہیں (یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے

---

[1] مسالکِ اربعہ میں سے اس مسلک کو باوجودیکہ یہ رُتبۃً، تحقیقاً اور قبولاً باقی سب مسالک پر فائق و مقدم ہے، آخر میں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ اسی کی کچھ تفصیل مطلوب تھی اور پہلے تین مسالک چونکہ ہمارے بلاد میں کم پائے جاتے ہیں اس لیے ان کے متعلق اجمال سے کام لیا گیا ہے۔

نصابِ تعلیم میں داخل ہے) :-

ولما ھو مقرر عند المحققین انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی یرزق متمتع بجمیع الملاذ والعبادات غیر انہ احجب عن ابصار القاصرین عن شریف المقامات۔

(نور الایضاح ص)

محققین کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ حضور انور زندہ ہیں، آپ کو رزق بھی ملتا ہے اور عبادات سے آپ لذت بھی اٹھاتے ہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ وہ ان نگاہوں سے پردے میں ہیں جو ان مقامات تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں۔

۲- مراقی الفلاح میں ہے :-

ینبغی لمن قصد زیارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یکثر الصلوٰۃ علیہ فانہ یسمعہا و تبلغ الیہ۔ (ص مصر)

جو شخص حضورِ اکرمؐ کی زیارت کرنے کے لیے آئے، اسے چاہیے کہ کثرت سے درود عرض کرے، کیونکہ آپ اسے خود سن رہے ہوتے ہیں اور (دور سے) آپ کو پہنچایا بھی جاتا ہے۔

۳- طحطاوی :-

(فانہ یسمعہا) ای اذا کانت بالقرب منہ صلی اللہ علیہ وسلم (وتبلغ الیہ) ای یبلغھا الملک اذا کان المصلی بعیداً۔

(طحطاوی ص مصر)

آپ صلوٰۃ وسلام کو اس وقت خود سنتے ہیں جب قریب سے عرض کیا جا رہا ہو اور فرشتے اس وقت پہنچاتے ہیں جب یہ دور سے پڑھا جا رہا ہو۔

تنبیہ : علامہ شرنبلالیؒ کا مذکورہ سابقہ فیصلہ اور پھر اسے مختارِ محققین قرار دینا اگر کچھ بھی محلِ نظر ہوتا، تو اس کے شارح اور پھر شارح کے شارح ہر مرحلے پر اس کی تصدیق و توثیق نہ کرتے چلے جاتے؛ آخر کسی مقام پر تو اسے نشانۂ ضعف

کیا جاتا۔ جب ہر مرحلہ پر اسی کی تصدیق ہی تصدیق ہے، تو اس یقین سے چارہ نہیں کہ فقہ حنفی کا متفقہ نظریہ یہی ہے کہ حضورِ انورؐ اپنے روضۂ اطہر میں جسمانی طور پر فائز الحیات ہیں اور قریب عرض کیے گئے صلوٰۃ و سلام کو خود بلا واسطہ سنتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

۴۔ محقق علی الاطلاق امام ابن الہمامؒ (المتوفی سنہ ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں:۔

ثم تستقبل القبر بوجهك، ثم تقول السلام عليك ايها النبي و رحمة الله وبركاته ..... وذالك انه عليه السلام في القبر الشريف المكرم على شقه الايمن مستقبل القبلة فليكثر دعاءه بذالك في الروضة الشريفة عقيب الصلوٰة وعند القبر و يجتهد في خروج الدمع فانه من امارات القبول وينبغي ان يتصدق بشيء على جيران النبي صلى الله عليه وسلم ثم ينصرف متباكيا متحسرًا على الفراق الحضرة النبوية صلى الله عليه وسلم والقرب منها ..... ثم يسئل النبي صلى الله عليه وسلم الشفاعة فيقول يا رسول الله اسألك الشفاعة يا رسول الله! ..... الخ

(فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۳۳۷ اواخر الحج مصر)

تم حضورِ انورؐ کی قبرِ شریف کے سامنے ہو کر السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ عرض کرو ..... اور یہ اس لیے کہ حضورؐ علیہ السلام اپنی قبرِ شریف میں دائیں کروٹ، قبلہ کی طرف رُخ کیے ہوئے ہیں۔ روضۂ شریفہ میں درود شریف کے بعد اور قبر کے پاس بکثرت سے دعا کرے اور آنسو آجانے کی حد تک زاری کرے کیونکہ یہ قبولیت کی علامات میں سے ہے اور چاہیے کہ روضۂ اطہر کے مجاورین پر کچھ صدقہ بھی کرے۔ پھر روتا ہوا اور آپؐ کے قربِ اقدس سے جدا ہونے کا غم ساتھ لیتے ہوئے واپس ہو ..... پھر حضورِ انورؐ سے شفاعت کرنے کی التجا بھی کرے اور کہے کہ یا رسول اللہ! میں شفاعت کے لیے سوال عرض کرتا ہوں۔

۵ - علامہ ابن عابدین شامیؒ :-

امام شافعیؒ کے نزدیک مالِ غنیمت میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ آپؐ کی وفات شریفہ کے بعد خلیفہ کو پہنچتا ہے، کیونکہ آں حضرتؐ کو یہ حق قیادت اور قیام بامور العامہ کی بنا پر پہنچتا تھا اور اب آپؐ کے بعد یہ انتظامیہ قیادت بصورت خلافت موجود ہے۔ احناف کے نزدیک آپؐ کا یہ حق امامت پر مبنی نہیں بلکہ رسالت پر مبنی تھا۔ آپؐ کی وفات شریفہ کے بعد کسی نئے رسول کی آمد شرعاً نہیں، پس حنفیہ کے نزدیک سہم رسول وفاتِ پیغمبرؐ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے یہ بحث چلتی ہے کہ کیا رسول کی رسالت اس کی وفات پر ختم ہو جاتی ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں صرف حکماً باقی ہوتی ہے، حقیقتہً نہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ وہ حقیقتہً باقی ہے۔ یعنی حضورؐ اب بھی حقیقی طور پر رسول ہیں۔ رسالت کو صرف حکماً باقی کہنا صحیح نہیں۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں :-

افاد فی الدر المنتقی انه خلاف الاجماع قلت وما نسب الی الامام الاشعری امام اهل السنة والجماعة من انکار ثبوتها بعد الموت فهو افتراء وبهتان والمصرح فی کتبه وکتب اصحابه خلاف ما نسبه الیه بعض اعدائه لان الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام احیا فی قبورهم وقد اقام النکیر علی افتراء ذالك ابو القاسم القشیری رح -

(رد المحتار جلد ۳ باب المغنم ص۳۶۶)

ترجمہ :- درِ منتقی میں ہے کہ حضورؐ کی رسالت آپؐ کی وفات شریفہ کے بعد اب بھی حقیقتہً باقی ہے اور اسے صرف حکماً باقی کہنا خلافِ اجماع ہے اور امام اہل سنت امام اشعریؒ کی طرف جو اس کا انکار منسوب ہے، وہ افترا اور بہتان ہے۔ اشاعرہ کی کتابوں میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے آپؐ کی وفات شریفہ کے بعد رسالت کا حقیقتہً باقی نہ رہنا اہلِ سنت کے بعض دشمنوں نے ان کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

"کیونکہ انبیاء علیہم السلام تو اپنی قبورِ شریفہ میں زندہ موجود ہوتے ہیں"۔
(شامی ج باب المغنم وقسمتہ لعد قسمۃ الخمس ص ۳۶۶)

ان المنع هنا لانتفاء الشرط وهو اما عدم وجود الوارث بصفة الوارثية كما اقتضاه الحديث واما عدم موت الوارث بناءً على ان الانبياء احياء فى قبورهم كما ورد فى الحديث -

(رسائل ابن عابدين جلد ۲ ص ۲۰۳ مصر - الرحيق المختوم شرح قلائد المنظوم)

۶- علامہ عینیؒ :-

انهم لا يموتون فى قبورهم بل هم احياء -

یقیناً انبیائے کرامؑ اپنی قبورِ شریفہ میں مُردہ نہیں ہوتے، بلکہ وُہ وہاں زندہ ہوتے ہیں۔

(عینیؒ شرح بخاری جلد ۷ ص ۶)

۷- امام مُلّا علی قاریؒ :-

ان الانبياء احياء فى قبورهم فيمكن لهم سماع صلوٰة من صلى عليهم -

بے شک انبیائے کرامؑ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں - یہاں تک کہ وُہ سُن سکتے ہیں، اُس شخص کو جو ان پر درُود پڑھے -

(مرقات جلد ۲ ص ۲۰۹)

المعتقد المعتمد انه صلى الله عليه وسلم حى فى قبره كسائر الانبياء فى قبورهم وهم احياء عند ربهم وان لارواحهم تعلقا بالعالم العلوى

عقیدہ جس پر پُورا اعتماد ہے، وُہ یہی ہے کہ حضورؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور اسی طرح تمام انبیاءؑ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کی ارواحِ قدسیہ کو عالمِ علوی اور عالمِ سفلی کے ساتھ ایک تعلق بھی ہوتا ہے،

والسفلی کما کانوا فی الحال الدنیوی۔

اور ایسا ہی تعلق انھیں اس دُنیا میں بھی حاصل تھا۔

(شرح الشفاء للعلی القاری جلد ۲ ص ۱۴۲ مصر)

اکابرِ فرقہ اہلحدیث

اہلِ سُنّت کی کشتی کے پانچویں سوار حضرات فرقہ اہلِ حدیث ہیں۔ ان کے اکابر کی تصریحات بھی دیکھیے:۔

۱۔ قاضی شوکانی یمنیؒ:۔

(۱) روحه صلی اللہ علیه وسلم لا تفارقه لما صح ان الانبیاء احیاء فی قبورهم۔ (تحفة الذاکرین شرح حصن حصین للشوکانیؒ ص ۲۸ مصر)۔

حضور انورؐ کی رُوح مبارک اپنے جسدِ اطہر سے جُدا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ صحیح حدیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ انبیاءِ کرامؑ اپنی قبورِ شریفہ میں زندہ ہوتے ہیں۔

(۲) انه حی فی قبره.... وقد ذهب جماعة من المحققین الی ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم حی بعد وفاته۔ (نیل الاوطار جلد ۳ ص ۲۱۰، ۲۱۱)

حضورِ اکرمؐ اپنی قبرِ شریف میں زندہ ہیں۔ اور محققین کی ایک جماعت کا یہی فیصلہ ہے کہ حضورؐ اپنی وفاتِ شریفہ کے بعد زندہ ہیں۔

۲۔ شیخ کبیر عبد اللہؒ بن محمدؒ بن عبد الوہاب نجدی:۔

---

[1] آپ نے اپنے عقائد پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا بیشتر حصہ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے اپنی کتاب اتحاف النبلاء مقصد دوم میں حرف المیم کے ماتحت نقل فرمایا ہے۔ شیخ عبد اللہ نے اس میں ان تمام الزامات کی تردید کی ہے، جو اس طبقے سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

والذی نعتقد ان رتبة نبینا صلی الله علیه وسلم اعلی مراتب المخلوقین علی الاطلاق وانه حی فی قبره حیوة مستقرة ابلغ من حیات الشهداء المنصوص علیها فی التنزیل اذ هو افضل منهم بلا ریب وانه یسمع من یسلم علیه۔

(اتحاف النبلاء ص۴۱۵ مطبوعہ کانپور)

ہمارا یہی اعتقاد ہے کہ حضور اکرمؐ کا مرتبہ تمام مخلوقات سے علی الاطلاق اعلیٰ ہے اور یہ کہ آپؐ اپنی قبر شریف میں دائمی طور پر زندہ ہیں اور آپؐ کی یہ حیات شہداء کی حیات سے، جو قرآنِ پاک میں منصوص ہے، بہت بالا ہے؛ کیونکہ آپؐ ان سے بلا ریب افضل ہیں اور آپؐ اپنے روضۂ اطہر میں سلام عرض کرنے والوں کے سلام کو خود سنتے ہیں۔

۳۔ نواب صدیق حسن خانؒ:۔

(۱) حدیث "من صلی علی عند قبری سمعته" (جو میری قبر کے پاس آکر درود پڑھتا ہے، اسے میں خود سنتا ہوں) کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

اسناده جید (الدلیل الطالب ص۸۴۴)

(۲) حج الکرامۃ ص۲۸۵ میں واقعۂ حرہ نقل فرمایا ہے کہ امام التابعین حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ میں ان دنوں حجرۂ شریفہ سے اذان اور اقامت سنتا تھا۔" روضۂ اطہر سے آواز آنے کی اس روایت کے متعلق نواب صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

"ابنِ جوزی بسندِ متصل تا سعید بن المسیبؒ لایا ہے کہ سعید نے ایسا فرمایا"۔

حج الکرامۃ ص۲۸۵

۴۔ حضرت مولانا میاں نذیر حسین صاحب دہلویؒ:۔

"اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ خصوصاً

---

۱ وسیأتی تفصیله وراجع له ص۲۰۶ من هذا الکتاب۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی عند القبر درود بھیجتا ہے، میں سنتا ہوں اور دُور سے پہنچایا جاتا ہوں"۔ (فتاویٰ نذیریہ ۲ ص۵۵ ضمیمہ)

۵- مولینا عظیم آبادی شارح ابی داؤد:-

ان الانبیاء فی قبورهم احیاء (عون المعبود جلد ا ص۴۵۰)۔	انبیاء کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

۶- التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی میں منقول ہے:-

(۱) انهم احیاء فی قبورهم یصلون وقد قال النبی ؐ من صلی علیّ عند قبری سمعته و من صلی علیّ نائیاً بلغته۔ (ص۲۳۷)	انبیاء کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں، اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور حضور نے فرمایا ہے کہ جو مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھے اُسے میں خود سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

(۲) التعلیقات السلفیہ جلد ا ص۱۹۵ پر سنن نسائی، مطبوعہ دہلی جلد ا ص۱۸۵ کا پورا حاشیہ (جو حیاتِ قبریہ کے حیاتِ جسمانی عنصری اور غیر معطل عن الاشتغال الطیبہ ہونے پر نہایت واضح بیان اور مکمل برہان ہے) منقول ہے اور مؤلف نے اپنی عادت کے مطابق یہاں کوئی اختلافی نوٹ نہیں لکھا۔

۷- "ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ رتبہ حضور انور کا تمام مخلوق کے مراتب سے اعلیٰ ہے، وہ اپنی قبر میں حیاتِ برزخیہ سے زندہ ہیں، جو کہ حیاتِ شہداء سے افضل و اکمل ہے اور سلام کہنے والے کا آپ سلام سنتے ہیں"۔

(الهدیة السنیة والتحفة الوهابیة النجدیة ص۴۲ مطبوعہ مصر)

۸- پاکستان میں سعودی عرب کے سابق سفیر علامہ عبد الحمید الخطیب فرماتے ہیں:-

"کیا واقعی علمائے نجد اور علمائے وہابیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے ہاں" الصلوٰۃ و السلام علیک یا رسول اللہ" کہنا حرام ہے؟ تو میں نے اس کو جواب دیا کہ تمام اسلافِ وہابیہ اس سلام کو جائز قرار دیتے ہیں، بعض لوگ خواہ مخواہ اپنے غلط عقائد وہابیہ کے ساتھ خلط ملط کر کے وہابیہ کو بدنام کر رہے ہیں۔ جیسا کہ انڈونیشیا کی ایک جماعت اَدْرنغ وہابی کے نام سے مشہور ہے، مگر ان کے عقائد سراسر وہابیہ کے خلاف ہیں، اس سے متاثر ہو کر میں نے یہ قصیدہ لکھا اور اس کو اجلہ علمائے نجد کے سامنے پیش کیا، سب نے تصویب فرمائی"۔ (دیباچہ رسالہ اسمی الرسالات ملک ۶)

اس قصیدہ میمیہ کا پہلا شعر یہ ہے ؎

علیک سلام اللہ یا سید الورٰی

ومن قدرہٗ عند الالٰہ عظیم

یہ پورا قصیدہ "تحیۃ الحبیب" علامہ مذکور نے روضۂ اطہر کے سامنے کھڑے ہو کر پڑھا تھا۔

عقائدِ متکلّمین در حیات النبیّین

علمِ کلام کے مشہور امام علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں:۔

"صلوٰت و برکات چنداں کہ فہم از و پر شود و اندیشہ درو گم گردد انہ سر تجھ کبریائی او نثار رواں پاک و کالبد زندہ ساکن مدینہ ۔۔۔ ۔۔۔"

پھر اہلِ سنت کے عقائد شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"و از اں جملہ آنست کہ بدانند کہ کالبد وے را زمین نخورد و بوسیدہ نشود و چوں زمین از وے شگافتہ شود کالبد وے بحالِ خود باشد و حشر وے و جملہ انبیاءؑ چنیں باشد و حدیث درست است کہ ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیا

—— هم احیاء فی قبورهم یصلون ۔ واقفِ ایں ہمہ پیغمبر با برخیزد از گور ——
دانستنِ ایں ہمہ کہ یاد کردیم مہم است۔"

(کتاب المعتمد فی المعتقد باب فصل ۱۲
للعلامۃ تورپشتی ؒ)

تتمۃ الفصل

اشاعرہ اور ماتریدیہ کا فیصلہ

۱۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی القبر حی یصلی ویعلم وتعرض علیہ اعمال الامۃ و اللہ تعالیٰ خلق ملٰئکۃ سیاحین یبلغون الیہ الصلوٰۃ من امتہ ۔ (الروضۃ البھیۃ فیما بین الاشاعرۃ الماتریدیۃ ص۱۵)

حضورِ اکرمؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں، علم و احساس آپ میں برابر موجود ہیں امت کے اعمال آپ پر پیش ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسے فرشتے پیدا کر رکھے ہیں جو زمین میں سیاحت کرتے رہتے ہیں اور اُمت کا صلوٰۃ وسلام پہنچاتے رہتے ہیں

۲۔ عندھم محمد صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ ۔ (طبقات الشافعیۃ جلد۲ ص۲۷۹)

اشاعرہ کے نزدیک حضورؐ اپنی قبرِ مبارک میں زندہ ہیں ۔

۳۔ قال الاستاذ ابو منصور البغدادی قال المتکلمون المحققون من اصحابنا ان

امام ابو المنصور بغدادیؒ نے فرمایا ہمارے اصحاب محققینِ متکلمین کا یہی فیصلہ ہے کہ حضورِ اکرمؐ اپنی وفاتِ شریفہ کے بعد

نبیّنا صلی اللہ علیہ وسلم حیّ — پھر زندہ ہیں۔
بعد وفاتہ۔ (اعلاء السنن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳)

الفصل الثّالث

شواھد الحیات من بیان الواقعات

واقعۂ حرّہ

اسلامی تاریخ کا یہ سانحہ یزید کے عہدِ حکومت میں پیش آیا۔ مظالمِ کربلا کے بعد سنہ ۶۳ھ میں مسلمانوں کی تاریخ اس خونی المیہ سے رنگی گئی۔ یزید نے اہلِ مدینہ پر جن میں بہت سے صحابہ کرام رض اور اکثر تابعینِ کرام رح تھے، فوج کشی کا حکم دیا۔ مسلم بن عقبہ اس شامی فوج کا سردار تھا۔ اس لشکر نے اپنے ڈیرے حرّہ کے مقام پر ڈالے۔

وحرة ھٰذہ ارض بظاھر المدینة لھا حجارة سود کثیرة۔ — حرّہ مدینۂ منورہ کے باہر وہ زمین ہے جہاں بہت سے سیاہ پتھر پائے جاتے ہیں۔

(مجمع البحار صفحہ ۲۵۲)

جب قتلِ عام اور لوٹ کا بازار گرم ہوا تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس وقت مسجدِ نبوی میں حضرت سعید بن المسیّب کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

حضرت سعید بن المسیّب رح بڑے جلیل القدر تابعی تھے، ان کی عظمتِ شان کے باعث انھیں افضل التّابعین کہتے ہیں۔ آپ نے سینکڑوں ان ہستیوں کو دیکھا تھا جن کی آنکھیں آں حضرت کی دولتِ دیدار سے بارہا شرف یاب ہو چکی تھیں۔

امام دارمی رح، ابنِ سعد رح، ابو نعیم رح، زبیر بن بکّار رح اور علامہ ابن الجوزی رح روایت کرتے

ہیں کہ حضرت سعید بن المسیبؒ نے ارشاد فرمایا :۔

اذا حانت الصلوٰۃ اسمع اذاناً یخرج من قبل القبر الشریف۔ ....لا یاتی وقت الصلوٰۃ الا وسمعت الاذان من القبر ثم اقیمت الصلوٰۃ فتقدمت فصلیت وما فی المسجد احد غیری۔ (خلاصۃ الوفا للسمہودی ص۳۸)

جب نماز کا وقت ہوتا تھا، میں قبر شریف سے اذان کی آواز سنتا تھا۔ .... جب بھی نماز کا وقت آتا، میں روضۂ اطہر سے اذان کی آواز سنتا، پھر اقامت بھی ہوتی اور میں اسی اقامت سے نماز پڑھتا، ان دنوں مسجدِ نبوی میں میرے سوا اور کوئی نہ ہوتا تھا۔

اسی واقعہ کو محدثِ شہیر علامہ سخاویؒ نے بھی القول البدیع میں نقل کیا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

"ابن جوزیؒ بسندِ متصل تا سعید بن المسیبؒ لایا ہے۔" (حج الکرامۃ ص۲۸۵)

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں :۔

وقضیۂ سماع سعید بن المسیبؒ در ایامِ واقعہ حرہ اذان از حجرہ شریفہ تا سہ روز کہ مردم مفارقت مسجدِ نبوی کردہ بودند مشہور است۔ (جذب القلوب ص۱۶۸، مدارج جلد۲ ص۱۵)

ایامِ حرہ میں سعید بن المسیبؒ کے حجرۂ شریفہ سے تین دن تک اذان سننے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ ان دنوں لوگ مسجدِ نبوی میں نہ آتے تھے۔

قبر سے آواز آنے کی ایک اور مثال

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آں حضرتؐ کے بعض صحابہؓ نے بے خبری میں ایک قبر پر خیمہ گاڑ دیا، اس سے سورۂ تبارک الذی بیدہ الملک کی آواز آرہی تھی، حتیٰ کہ اس نے تمام سورت ختم کی۔ صحابہؓ نے آکر یہ واقعہ حضورِ انورؐ

کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا :۔

هی المانعة المنجية وتنجيه من عذاب القبر۔	یہ سورت عذابِ قبر سے نجات دینے والی ہے۔

اسے امام بیہقیؒ اور امام حاکمؒ نے بھی روایت کیا ہے۔ حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ نے بھی التکشف ص۴۳ پر نقل فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب علمہ اتم واحکم فی کل باب۔

اسے اور مذکورہ سابقہ واقعہ حرّہ کو "واقعہ محال" کہہ کر نظرانداز نہ کیا جائے، اس لیے کہ اکابر علمائے ثقات اسے ایک اصول اور ضابطے کے ماتحت ذکر کرتے آئے ہیں۔ خاتم المحدثین حضرت مولانا السید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

ان كثيرًا من الاعمال قد ثبتت فی القبور كالاذان والاقامة عند الدارمیؒ وقرأة القرآن عند الترمذی۔ (فیض الباری جلد ۱ ص۱۸۱)	بے شک بہت سے اعمال قبروں میں بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں، جیسے کہ دارمیؒ کی روایت میں اذان اور اقامت کا وجود (واقعہ حرّہ) اور ترمذیؒ کی روایت سے قبر میں قراءتِ قرآن کا ثبوت ملتا ہے۔

واقعہ سلطان نورالدین شہید محمود بن زنگیؒ

سنہ ۵۵۷ھ

سلطان نورالدین شہیدؒ (شاہِ مصر) نے ایک رات سرورِ انبیاء حضور نبی کریمؐ کو تین بار خواب میں دیکھا کہ وہ سامنے کھڑے دو شخصوں کی طرف اشارہ کرکے فرما رہے ہیں "جلدی پہنچو اور مجھے ان دو شخصوں کے شر سے محفوظ کرو۔" سلطان نے اپنی فراست سے معلوم کرلیا کہ مدینہ منورہ میں کوئی بہت ناخوشگوار واقعہ پیش آرہا ہے۔ سلطانِ مذکور

اسی وقت رات کے آخری حصّے میں اپنے بیس خاص آدمیوں کے ساتھ بہت سا مال ساتھ لے کر مدینہ منورہ کی طرف چل پڑا، اور سولہ دِنوں میں شام سے مدینہ منورہ پہنچا۔

(جذب القلوب ص۱۱۵، مدارج النبوۃ جلد ۲ ص۹۰۵)

آخر کار پتہ چلا کہ دو انگریز جو بظاہر بہت پرہیزگار اور عبادت گزار بنے ہوئے تھے، روضۂ اطہر کے قریب ایک رباط میں مقیم ہو کر سرنگ کے ذریعے قبرِ منوّر تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں عیسائی بادشاہ نے اس ناپاک پروگرام کے ساتھ بھیجا ہوا تھا کہ جسد اطہر کو وہاں سے منتقل کر لیا جائے۔ یہ لوگ حاجی بن کر حرم شریف میں داخل ہوئے تھے۔

جس رات وہ روضۂ اطہر کے قریب پہنچنے والے تھے، ابر و باراں اور رعد و برق کا ظہور ہوا، زمین کانپنے لگی اور صبح سلطان نور الدین مدینہ منوّرہ میں حاضر ہو گیا۔ سلطان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ بالآخر وہ ملعون فریب کار قتل کر دیے گئے اور سلطانِ عادل نے حجرہ شریفہ کے گرد خندق کھدوا کر ایک سیسہ پلائی چاردیواری بنا دی تاکہ جسدِ اطہر تک پھر کسی کی رسائی نہ ہو سکے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"ایں قصہ را جمیع مورخان مدینۂ منورہ و مثل شیخ جمال الدین مطری و مجدد الدین فیروز آبادی و غیر ایشاں از علمائے اعلام ذکر کردہ اند و تصحیح نمودہ۔" (جذب القلوب ص۱۱۹)

"قلت و کذالک فی خلاصۃ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ ص۱۶۱ دائی الشیخ السمہودی بالاسناد والاعتماد

تتمۃ الفصل

محب طبری ریاض النضرہ میں اس جیسا ایک اور عجیب واقعہ نقل کرتے ہیں:۔

"روافضِ حلب کی ایک جماعت حاکمِ مدینہ کے پاس آئی اور سے (مغالطہ!)

بہت سی رشوت اور لالچ دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ انھیں رات کے وقت حجرۂ شریفہ تک باریابی دے (تاکہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اجسادِ مطہرہ کو کسی اور جگہ منتقل کر سکیں)۔ امیر نے دربان کو کہہ دیا کہ جب وہ آئیں، تو حرم کا دروازہ کھول دے اور انھیں کسی بات سے نہ روکے۔

دربان کہتا ہے کہ "جب عشاء کی نماز ہو چکی اور تمام دروازے بند ہو گئے۔ چالیس رافضی کھودنے گرانے کے آلات اور شمعیں لے کر 'بابُ السلام' پر آ گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے امیر کے حکم کے مطابق دروازہ کھول دیا اور خود ایک گوشے میں بیٹھ کر رونے لگا۔

خدا کی قدرت کہ ابھی وہ منبر شریف کے برابر بھی نہ پہنچے تھے اور اس ستون کے قریب ہی تھے، جو حضرت عثمانؓ کے ایزاد کردہ حصۂ مسجد کے ساتھ ہے کہ تمام کے تمام اپنے سب آلات و سامان کے ساتھ نیچے دھنس گئے .. والیٔ مدینہ جو بدمذہب اور منافق تھا انجام کا منتظر تھا اس نے مجھے بلایا اور ان لوگوں کا حال پوچھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا، پورے کا پورا سنا دیا۔"

امیر نے کہا "کیا تو دیوانہ ہو گیا ہے، کیا کہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا "امیر خود جا کر دیکھ لیں۔ ان کے دھنسنے کے کچھ آثار[1] اور ان کے کپڑوں کے بعض نشان ابھی باقی ہیں"۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں :-

---

[1] دھنسنے کے کچھ آثار اس لیے باقی رہ گئے تھے کہ وہ ملعونین کیفرِ کردار کو پہنچنے کے بعد وہاں سے اکھاڑ کر پھر کسی دوسری جگہ پھینکے جا سکیں۔ اس پاک سرزمین میں انھیں ہمیشہ کا استقرار کیسے مل سکتا تھا۔ اگرچہ "روضۃ من ریاض الجنۃ" کی حدود آگے منبر شریف سے شروع ہوتی تھیں اور حجرۂ مقدسہ تک پہنچتی تھیں اور یہ جگہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس قطعۂ قدسیہ سے ذرا پہلے تھی، تاہم اس کا بھی احترام قائم رکھا گیا۔ ان ملعونین کے جو حصے دھنسنے سے باقی رہ گئے تھے پھر ان پر حکم قتل جاری کیا گیا تھا۔ زیادہ تفصیل کے لیے تحفۂ اثنا عشریہ فارسی صفحہ ۱۰۶، مطبوعہ لکھنؤ دیکھیے ——— و راجع لہ کتاب الاستبصار للفاضل السمنانی القاضی۔

"طبری نسبتِ این حکایت بہ ثقات می کند کہ بہ صدق و دیانت مشہور اند و بعضی مؤرخانِ مدینہ نیز ذکر کردہ اند"۔ (جذب القلوب ص۱۳۳)

ارشاداتِ نبوت، خلفائے راشدینؓ کے نظریاتِ قدسیہ، اُم المومنینؓ اور صحابہ کرامؓ کے بیاناتِ عالیہ مذاہبِ اربعہ کی تصریحات متکلمینِ کرامؒ کے فیصلے اور شواہد واقعات یکے بعد دیگرے آپ ملاحظہ فرمالیجیے تاریخِ اسلامی کے ان مختلف ادوار میں حیاتِ انبیاءؑ کا مسئلہ اس کثرت سے بیان ہوتا رہا کہ ان تمام نقول کا استقصا، اور دلائل کا احصاء قریب قریب ناممکن ہے، ہاں یہ حقیقت لطف سے خالی نہیں کہ جہاں تاریخ کے ہر دور میں یہ مسئلہ اتنے شد و مد سے سامنے آتا رہا، وہاں ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ سوادِ اعظم اہلِ سنت کے کسی فقہی یا کلامی مسلک نے اس مرکزی نقطۂ حیات سے سرِ مو بھی تجاوز کیا ہو۔ تاریخ کے ہر دور میں بعض ائمہ و اکابر کا اسے بیان کر دینا اور دوسرے اعیانِ امت میں سے کسی کا اس پر نکیر نہ کرنا، اس حقیقت کی واضح شہادت ہے کہ انبیائے کرامؑ کی حیاتِ برزخیہ کے جسمانی اور اسی دنیا والے جسم سے قائم ہونے پر جمیع اہلِ حق، اہلِ سنت، کا تاریخِ ملت کے ہر دور میں اجماع رہا ہے۔

شہاداتِ اجماع

۱۔ محدثِ کبیر علامہ سخاویؒ تلمیذ خاتمۃ الحفاظ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ:۔

نحن نؤمن و نصدق بانه صلی اللہ علیه وسلم حی یرزق فی قبرہ وان جسدہ الشریف لا تأکله الارض والاجماع علی ھذا۔ (القول البدیع ص۱۲۵)	ہمارا ایمان ہے اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضورِ اکرمؐ اپنی قبرِ شریف میں زندہ ہیں آپ کو وہاں رزق بھی ملتا ہے اور آپ کے جسدِ اطہر کو مٹی نہیں کھاتی اور اس عقیدے پر اہلِ حق کا اجماع ہے۔

۲۔ شیخ الاسلام محدث شہیر حضرت علامہ عینیؒ :۔

ومذھب اھل السنۃ و الجماعۃ ان فی القبر حیاۃً و موتًا فلابد من ذوق الموتتین لکل احد غیر الانبیاء۔
(عینی علی البخاری جلد ۷ ص ۶۰۱)

پورے اہلِ سنّت والجماعت کا یہی مذہب ہے کہ قبر میں حیات اور پھر موت یہ دونوں سلسلے ہوتے ہیں پس ہر ایک کو دو موتوں کا ذائقہ چکھنے سے چارہ نہیں، ماسوائے انبیاءؑ کے (کہ وہ اپنی قبروں میں زندہ رہتے ہیں، ان پر دوبارہ موت نہیں آتی)۔

۳۔ علامہ محقق محمد عابد السندیؒ اُستاذ حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ :۔

اما ھم (ای الانبیاء) فحیاتہم لاشک فیھا و لاخلاف لاحد من العلماء فی ذالک .... فھو صلی اللہ علیہ وسلم حیٌ علی الدوام۔
(رسالہ مدنیہ ص ۱۱)

انبیائے کرامؑ کی حیات میں کوئی شک نہیں اور نہ علماء میں سے کسی کا اس سلسلے میں اختلاف ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اب دائمی طور پر زندہ ہیں۔

۴۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ :۔

حیات متفق علیہ است ہیچ کس را دروے خلافے نیست۔
(اشعۃ اللمعات جلد ۱ ص ۶۱۳)

حضورِ انورؐ کی حیات ایک متفق علیہ اجماعی مسئلہ ہے، کسی کا (اہلِ حق میں سے) اس میں اختلاف نہیں۔

۵۔ نواب قطب الدین صاحب دہلویؒ :۔

" زندہ ہیں انبیاء علیہم السلام قبروں میں " یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ کسی کو اس میں خلاف نہیں کہ حیات ان کو وہاں حقیقی جسمانی دُنیا کی سی ہے[1]" (مظاہرِ حق جلد ۱ ص ۴۴۱)

---

[1] حی احیان است کہ ان حضرت شاہ کی اس حیات فی البرزخ کو دنیوی کہا ہے اس کی مراد صرف یہی ہے کہ آپ کا دنیوی جسد عین الحیات ہے جو اس دُنیا میں تھا نہ یہ کہ اس عالمِ دنیا کی حیات کے جمیع لوازم وہاں ثابت ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی دنیوی "حیات کا مفہوم ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں۔ "انبیائے کرام کو انہیں حیاتِ دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں" (لطائف قاسمیہ ص ۳)

۶۔ قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ :۔

"قبر کے پاس .... انبیاءؑ کے سماع میں کسی کو اختلاف نہیں"۔

(فتاویٰ رشیدیہ جلد ۱ صفحہ)

جب جمیع اہل سُنّت کا یہ متفقہ اور مجمع علیہ عقیدہ ہے، تو پھر روضۂ اطہر کی حیاتِ جسمانی کا انکار آخر کن کا مذہب ہے؟

۱۔ شیخ الاسلام حضرتِ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں :۔

من انکر الحیوٰۃ فی القبر و هم المعتزلة و من نحا نحوهم و اجاب اهل السنة عن ذالك۔

(عینی علی البخاری جلد ۷ ص ۴۰۱)

جن لوگوں نے آں حضرتؐ کی قبر کی زندگی کا انکار کیا ہے اور وہ معتزلہ اور اُن کے ہم عقیدہ ہیں، اہلِ سُنّت نے اُن کے دلائل کے جوابات دیئے ہیں۔

۲۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے بھی اسی اندازِ بیان کو اختیار فرمایا ہے کہ منکرینِ حیات اہلِ سُنّت میں سے نہیں۔

قد تمسك به من انکر الحیوٰۃ فی القبر واجیب عن اهل السنة .... ان حیوٰته صلی اللہ علیه وسلم فی القبر لا یعقبها موت بل یستمر حیًا۔

(فتح الباری جلد ۷ ص ۲۲ مصر)

منکرینِ حیات فی القبر اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور اہلِ سُنّت کی طرف سے ان کا جواب دیا جاتا ہے کہ حضورؐ کی قبر کی زندگی ایسی ہے کہ دوبارہ اس پر موت نہیں اور آپؐ اب دائمی طور پر زندہ ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ نے بھی اس عبارت کو حاشیہ بخاری جلد ۱ ص ۵۱۷ پر نقل اور تسلیم فرمایا ہے۔

الفصل الرابع

وفیه اربعة من المباحث

مبحث اوّل

حیات فی القبر

جمیع اہل السنة والجماعة اس پر متفق ہیں کہ مرنے کے بعد قبر میں (یا جہاں بدنِ میّت پڑا ہو یا جہاں جہاں اجزاءِ بدن پھیلے ہُوئے ہوں، سب میں) پھر رُوح سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ یہ تعلق یا تو "دخولِ رُوح در جسد" سے قائم ہوتا یا اس کا تحقق "اتصالِ رُوح بجسد" سے ہوتا ہے۔

سوال وجواب کی منزل گزرنے کے بعد پھر یہ تعلق کمزور ہو جاتا ہے اور اتنا کمزور کہ اسے "موت فی القبر" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس منزل میں حیات صرف اس درجہ میں باقی ہوتی ہے کہ ثواب وعذاب کا ادراک ہوتا رہے، اور ہو سکتا ہے کہ حیات کا یہ درجہ رُوح کے بغیر ہو، اس لیے کہ رُوح اور حیات میں تلازم محض ایک امرِ عادی ہے کہ عام عادتِ الٰہی اسی طرح جاری ہے، عقلی یا شرعی نہیں؛ غالباً یہی وجہ ہے کہ بہت سے اشاعرہ اور حنفیہ رُوح وحیات کے اس تلازم کے قائل نہیں۔

خیر، یہ تو سوال وجواب کی منزل کے بعد کی بات ہے کہ اس درجے کی حیات رُوح کے ساتھ قائم ہوتی ہے یا رُوح کے بغیر، لیکن اس پر سب اہلِ تحقیق متفق ہیں کہ اس منزل سے پہلے کی "حیات فی القبر" رُوح کے ساتھ ہی قائم ہوتی ہے، خواہ "اعادہ رُوح بجسد" کے ساتھ خواہ "اتصالِ رُوح بجسد" کے ساتھ۔ بہر حال اس حیات کے

تعلق بالروح سے چارہ نہیں۔ یہ امر مجمع علیہ اور یقینی ہے کہ دفن کے بعد قبر کی پہلی منزل میں ایک دفعہ پھر تعلقِ بالرّوح سے زندہ کیا جاتا ہے۔ اور اس منزل کے گزرنے کے بعد عامۃ النّاس میں رُوح کا استقرار نہیں رہتا۔ اس زندگی پر پھر ایک دفعہ موت آتی ہے، ہاں یہ اماتت حقیقی نہیں ہوتی اور اس درجہ میں حساس باقی رہتا ہے کہ ثواب و عذاب کا ادراک ہوتا رہے۔

طریقِ حیات فی القبر

دفن ہونے کے بعد قبر کی پہلی منزل میں یہ حیات کیسے حاصل ہوتی ہے، اس باب میں سوادِ اعظم کے دو طبقے ہیں: ایک اعادۂ رُوح کا قائل ہے اور دُوسرا اتّصالِ رُوح کا مسلک رکھتا ہے۔ اس میں ترجیح کسے حاصل ہے، یہ براہِ راست ہمارا موضوع نہیں ہاں یہ امر یقینی اور متّفق علیہ ہے کہ بدنِ مدفون ایک دفعہ پھر تعلق بالرّوح سے فائز الحیات ہوتا ہے اور اس کے بعد قبر کی دُوسری منزل میں ایک دفعہ پھر حکمی موت وارد ہوتی ہے۔ اور یہ امر بھی اجماعی اور یقینی ہے کہ انبیاءؑ علیہم السّلام پر یہ دُوسری موت قطعاً نہیں آتی، ان کے لیے ایک ہی دفعہ موت کی لذّت شناسی ہے اور صحابۂ کرامؓ کا سب سے پہلا اجماع اسی مسئلے پر قائم ہوا تھا۔

آں حضرتؐ کی "حیات فی القبر" کے متعلق بھی دو نظریے بیان کیے جاتے ہیں۔ بعض حضرات اعادۂ رُوح کے قائل ہیں اور بعض اتّصالِ رُوح یا تاثیرِ رُوح کا مسلک رکھتے ہیں۔

یہ دونوں مسلک اسی ایک پہلے اختلاف کا نتیجہ ہیں کہ قبر کی حیاتِ ثانیہ اعادۂ رُوح سے حاصل ہوتی ہے؟۔ پھر اوّل الذکر مسلک زیادہ صحیح ہے اور اگر اس حیات کا تحقق اتصالِ رُوح سے ہے، تو پھر ثانی الذکر نظریہ زیادہ صحیح ہوگا۔ آئیے، چلیے

ہوئے یہ بھی دیکھنے جائیں کہ حیات فی القبر اعادۂ رُوح سے قائم ہوتی ہے یا اتصالِ رُوح سے۔

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

فتعاد روحه فی جسده فیاتیه ملکان فیجلسانه فیقولان له من ربك .... الحدیث رواہ احمد۔

(مشکوٰۃ ص۱۴۲ سطر ۱۹)

پس اس مرنے والے مومن کی رُوح پھر اس کے بدن میں لوٹائی جاتی ہے اور دو فرشتے اس کے سامنے کرتے ہیں۔ پس اسے بٹھلاتے ہیں اور پھر سوال وجواب کا سلسلہ ہوتا ہے۔

والحدیث صحیح (تنقیح الرواۃ جلد ۱ ص۳۴)

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:۔

"رواہ الامام احمد وابو داؤد وروی النسائی وابن ماجة اوّله ورواہ ابو عوانة الاسفرائنی فی صحیحه وذهب الی القول بموجب هذا الحدیث جمیع اهل السنة والحدیث من سائر الطوائف"۔

(کتاب الروح ص۵۱)

"النص الصحیح الصریح وهو قوله صلی الله علیه وسلم "فتعاد روحه فی جسده" (کتاب الروح ص۵۲)

"فالحدیث صحیح لا شك فیه" (ص۵۶)

"رواہ احمد صحیح بعض فی الصحیح والحدیث حسنة المنذری ورواہ ایضًا ابو داؤد والحاکم وابن ابی شیبه وابن منده وابو نعیم وابو عوانة الاسفرائنی فی صحیحه من طرق صحیحة والبیهقی وقال هذا حدیث صحیح الاسناد"۔ (تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ جلد ۱ ص۳۴)۔

ابن مندہ کی پوری روایت حافظ ابن قیمؒ نے کتاب الروح ص۵۶ تا ص۵۸ نقل کی ہے۔ اس میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں کہ رب العزت ملئکہ سے فرماتے ہیں :۔

ردوا روح عبدی الی الارض فانی وعدتھم انی اردھم فیھا (ص۵۸)	میرے بندے کی روح پھر زمین کی طرف لٹا دو کہ میرا وعدہ ہے کہ میں انھیں پھر زمین میں لوٹاؤں گا۔

اس کا حاصل یہی ہے کہ مرنے والوں کی روحیں علیین یا سجین سے تعلق قائم کرکے وہاں سے ہو کر پھر زمین کی طرف لوٹائی جاتی ہیں۔ اعادہ روح کی اس حدیث کے متعلق حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں :۔

ھذا حدیث ثابت مشھور مستفیض صححہ جماعۃ من الحفاظ ولا نعلم احدًا من ائمۃ الحدیث طعن فیہ بل رووہ فی کتبھم وتلقوہ بالقبول وجعلوہ اصلاً من اصول الدین۔ (ص۵۹)	یہ حدیث ثابت ہے، مشہور اور مستفیض ہے، حفاظ حدیث کی ایک بڑی جماعت نے اس کی تصحیح کی ہے اور ائمہ حدیث میں سے کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اُسے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے اسے قبول کیا ہے اور اس کو اصول دین میں سے ایک اصل قرار دیا ہے۔

المبحث الثانی

رد الاشتباھات فی تحقیق الرواۃ

حافظ ابن تیمیہؒ کا ارشاد :۔

قال الحافظ ابو نعیم الاصفھانی واما حدیث البراءؓ

رواه المنہال بن عمرو عن زاذان عن البراء فحدیث مشہور رواہ عن المنہال الجم الغفیر ورواہ عن البراء عدی بن ثابت ومحمد بن عقبہ وغیرہما ورواہ عن زاذان عطاء بن السائب قال وھو حدیث اجمع رواۃ الاثر علی شہرتہ واستفاضتہ وقال الحافظ ابو عبد اللہ بن مندۃ ھذا الحدیث اسنادہ متصل مشہور رواہ جماعۃ عن البراءؓ —— شرح حدیث النزول ص۷۸ للحافظ ابن تیمیہؒ۔

حافظ ابن قیمؒ کا ایک اور حوالہ :-

وھو حدیث صححہ جماعۃ من الحفاظ رح

اجتماع جیوش الاسلامیہ علی غزو المعطلۃ الجہمیۃ لابن القیمؒ ص۳۷

امام احمدؒ کی پہلی روایت کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں کہ :-

اس میں ایک راوی منہال بن عمرو ہے اور وہ "فتعاد روحہ فی جسدہ" کے قطعہ روایت میں متفرد ہے۔ ابن حزمؒ نے اس کے متعلق کہا ہے "لیس بالقوی"

جواباً عرض ہے کہ منہال بن عمرو کو امام جرح و تعدیل امام یحیی بن معینؒ نے ثقہ کہا ہے۔ امام عجلیؒ بھی اس کے ثقہ ہونے پر نص فرماتے ہیں۔ ابن حزمؒ چونکہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور یہ حدیث ان کے اعتقاد کی تردید کرتی تھی اس لئے انھوں نے اس حدیث کی تضعیف کر دی اور منہال بن عمرو کو ضعیف کہہ دیا۔ تنقیح الرواۃ میں ہے :-

وفی اسناد الحدیث منہال بن عمرو وثقہ ابن معینؒ	اس حدیث کی سند میں منہال بن عمرو ہے۔ اسے امام یحیی بن معینؒ اور عجلیؒ ثقہ قرار

والعجلي وقد تكلم ابن حزم في
المنهال ولا يلتفت لكلام ابن
حزم بعد احتجاج الشيخين به
ولما رأى ابن حزم حديث
المنهال رادا على معتقده
في انكار عذاب الاجساد
في قبورها طعن فيه وطعنه
مردود والحديث صحيح -
(تنقيح الرواة جلد ۱ ص ۳۱)

کہتے ہیں - ابن حزمؒ نے اس پر کلام کیا
ہے، لیکن اس کی کوئی پروا نہ کی جائے
کیونکہ حدیث کے دو بڑے امام اسے
حجت مان رہے ہیں - ابن حزمؒ چونکہ
عذاب قبر کے جسمانی ہونے کے قائل
نہ تھے اور یہ حدیث اُن کے عقیدہ کی
تردید کر رہی تھی - اس لئے اُنھوں نے
اس پر جرح کر دی، حالانکہ حدیث
صحیح ہے اور اس پر طعن مردود ہے -

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :-

فالمنهال احد الثقات
العدول قال ابن معين المنهال
ثقة وقال العجلي كوفي ثقة
واعظم ما قيل فيه انه
سمع من بيته صوت غناء
وهذا لا يوجب القدح في
روايته واطراح حديثه
وتضعيف ابن حزم له لا
شيء فانه لم يذكر موجبا
لتضعيفه غير تفرد بقوله
فتعاد روحه في جسده وقد

منہال عادل اور ثقہ لوگوں میں سے
ہیں - ابن معینؒ اور عجلیؒ انھیں ثقہ کہتے
ہیں - زیادہ سے زیادہ جو اُن پر اعتراض
ہے، وہ یہی ہے کہ ایک دفعہ اُن کے
گھر سے گانے کی آواز سُنی گئی تھی -
(یہ بھی قیل سے ہی ذکر ہوا ہے معلوم
نہیں صحیح ہے یا غلط - نیز اُس کا
مرتکب کون تھا اور کون نہیں) اور
یہ اُن کی روایت میں موجب قدح
نہیں اور ابن حزمؒ کا اسے ضعیف
کہنا بالکل واہی ہے - اس نے صرف

بتینا انہ لم یتفرد بہا بل رواہا غیرہ قد روی ما ھو ابلغ منہا۔ (ص ۵۹)	اس کا تفرد ہی بیان کیا ہے اور ہم ثابت کر آئے ہیں کہ وہ متفرد نہیں۔

دوسرا اعتراض

حضرت براء بن عازبؓ سے اس حدیث کو زاذان نقل کر رہا ہے اور اُس کا سماع حضرت براءؓ سے ثابت نہیں۔ علاوہ ازیں وہ بھی اس روایت میں متفرد ہے۔ نیز اس میں بھی ابنِ حزمؒ کو کلام ہے۔

جواباً گزارش ہے کہ حافظ ابو عوانہ اسفرائینیؒ نے زاذان کندی کا حضرت براءؓ سے صیغۂ سماع نقل کیا ہے۔ پس اعتراض کی بھی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ حافظ ابنِ قیمؒ لکھتے ہیں :۔

ھذہ العلۃ باطلۃ فان ابا عوانۃ الاسفرائنی رواہ فی صحیحہ باسنادہ قال عن ابی عمرو زاذان الکندی قال سمعت البرّاء۔ ص ۵۹	یہ علت باطل ہے، کیونکہ امام ابو عوانہ اسفرائنیؒ نے اسے اپنی صحیح میں اپنی سند سے روایت کیا ہے اور اس میں سماع کی تصریح ہے

تفرد زاذان کے متعلق فرماتے ہیں :۔

فالحدیث صحیح لا شک فیہ وقد رواہ عن البراء بن عازب جماعۃ غیر زاذان منھم عدی بن ثابت و محمد	پس حدیث صحیح ہے اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ براءؓ سے اسے زاذان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی روایت کیا ہے۔ انہیں میں عدی بن

بن عقبہ و مجاھد۔ ثابت محمد بن عقبہ اور مجاہد بھی ہیں۔

صـ ۵۶

اور توثیق زاذان کے متعلق ملاحظہ ہو :۔

امام یحیی بن معینؒ انھیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ ابن سعدؒ ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ خطیبؒ اور عجلیؒ نے بھی ثقہ کہا ہے۔ ابن عدیؒ اور حاکمؒ نے بھی توثیق کی ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ صـ ۳۰۲)۔ علامہ عزیزیؒ اس کی روایت کے متعلق لکھتے ہیں: "حدیث صحیح" (السراج المنیر جلد ۱ صـ ۵۱۲ مطبوعہ مصر)

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں :۔

و زاذان من الثقات روی عن اکابر الصحابۃ کعمرؓ وغیرہ وروی لہ مسلم فی صحیحہ قال یحیی بن معین ثقۃ قال حمید بن ھلال وقد سئل عنہ ھو ثقۃ لا تسأل عن مثل ھؤلاء۔ (کتاب الروح صـ ۵۹)	زاذان ثقہ راویوں میں سے ہے، اس نے حضرت عمرؓ جیسے اکابر صحابہؓ سے روایات لی ہیں۔ امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں اس کی روایت لی ہے یحیی بن معینؒ اسے ثقہ کہتے ہیں۔ حمید بن ہلالؒ سے زاذان کے متعلق پوچھا گیا، تو انھوں نے فرمایا ایسے ذمہ دار لوگوں کے متعلق پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

المبحث الثالث

اعادۂ روح کے متعلق متکلمین کا موقف

تفصیلات مذکورہ کے پیشِ نظر محدثین کا موقف تو بالکل بے غبار ہے کہ وہ طریقِ حیات فی القبر کے باب میں "اعادۂ روح" کے قائل ہیں، لیکن متکلمین کے متعلق عام طور پر یہی رائے ہے کہ وہ اعادۂ روح کے قائل نہیں، بلکہ اتصالِ روح سے بدنِ مدفون میں حیات تسلیم کرتے ہیں۔

حضرت مولٰنا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہ لکھتے ہیں :-

لیس المراد بالحی ههنا ما یعاد فیه الروح ویصدر عنه الافعال الاختیاریة بل ما له یدرک الالم واللذة فاذا خلق الله فیه ادراکا ...... یکون حیا لا جمادا۔ (عبدالحکیم علی الخیالی ۱۸۳)	اس جگہ "حی" سے مراد یہ نہیں کہ اس میں روح لوٹائی گئی ہو اور اس سے افعالِ اختیاریہ صادر ہوتے ہیں، بلکہ حیات سے مراد یہ ہے کہ وہ الم ولذت کا ادراک کر سکے۔ اس اندازِ حیات سے بھی وہ جماد ہونے سے نکل جاتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔

تحقیق المقام

اس مقام پر تین مسلک بیان کیے جاتے ہیں :-

(۱) میت کو قبر میں زندگی ملتی ہے۔ پس عذابِ قبر برحق ہے۔ یہ مسلک اہلِ سنت والجماعت کا ہے۔

(۲) میت قبر میں جمادِ محض ہے۔ پس عذابِ قبر کچھ نہیں۔ یہ جمہور معتزلہ و بعض کا مسلک ہے۔

(۳) میت ہے تو قبر میں جماد اور بے جان، مگر اس پر عذاب پھر بھی ہوتا ہے۔ یہ مسلک معتزلہ کی شاخ صالحیہ اور فرقہ کرامیہ کا ہے۔

خیالیؒ کی عبارت "جوّز بعضهم تعذيب غير الحيّ" میں اس تیسرے مسلک کا بیان ہے۔ اس پر حضرت مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ انھیں الزام دیتے ہیں جسے ہم اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں :-

کہ جب تم میت کے لئے قبر میں عذاب مانتے ہو، تو پھر تمہارا اسے جماد کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ جماد تو اسے ہی کہتے ہیں، جس میں کہ کوئی احساس نہ ہو۔ پس اسے عذاب ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس میں اتنا احساس ہے کہ الم و لذت کا ادراک کر سکے، تو پھر اس کے لئے زندگی ثابت ہو گئی، جمادِ محض نہ رہا۔

اس مقام پر مولانا سیالکوٹیؒ حیاتِ میت کی تشریح میں وہ عبارت لکھتے ہیں، جو کہ پہلے لکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں مولانا مرحوم صالحیہ اور کرامیہ کو الزام دے رہے ہیں کہ جس "صورتِ عذابِ قبر" کو تم تجویز کر رہے ہو، اسے بھی حیاتِ قبر لازم آ رہی ہے۔ ہاں اس صورتِ حیات میں اعادۂ روح لازم نہیں ؛ چنانچہ "نبراس علیٰ شرح العقائد" میں ایسے جواب پر لکھا ہے :-

هذا جواب اشكال اورده المعتزلة مستدلين بقوله تعالى لَا يَذُوقُونَ

یہ تو ایک اشکال کا جواب تھا، جو معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے پیش کیا تھا "وہ

فِيهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى -	نہیں چکھیں گے وہاں کوئی اور موت اُن کے لئے تو وہی موت ہے جو پہلے آچکی"۔

(نبراس ص ۳۲۳)

یہ صورتِ جواب کیوں اختیار کی گئی؟

اس لئے کہ اعادۂ رُوح کا مضمون متکلّمین کے نزدیک حدیثِ براء بن عازب رضی کی رُو سے خبرِ واحد سے ثابت ہو رہا تھا اور معتزلہ خبرِ واحد کی حجیت کے قائل نہ تھے۔ پس انہیں اعادۂ روح کی رو سے [illegible] سکتا تھا؛ ہاں عذابِ قبر کی روایات چونکہ حدِ تواتر تک پہنچ رہی تھیں اور اُن کی رُو سے میّتِ مدفون کے لئے لذّت والم کا ادراک ثابت ہو رہا تھا۔ اس لئے یہاں سے ہی حیاتِ میّت ثابت کرنے کے لئے ایک زینہ بنایا گیا۔ معتزلہ اور کرامیہ یقیناً اس کے جواب باصواب سے عاجز تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ متکلّمین نے "میّت میں پھر رُوح نہ لَوٹنے کو" کیا تحقیقِ واقعی کے طور پر بیان کیا ہے یا یہ صرف ایک الزامی شکل جواب کی تھی اور متکلّمین کا اصل مسلک وہی ہے جو محدثین کا تھا؟ شرح نبراس میں اس حقیقت سے اس طرح نقاب کشائی کی گئی ہے:-

وعندي في هذا الجواب	میرے نزدیک یہ جواب محلِ نظر ہے
بحث وهو ان الاحاديث	اس لئے کہ احادیثِ صحیحہ پکار پکار
الصحيحة ناطقة بان الروح	کر کہہ رہی ہیں کہ رُوح پھر جسم سے
تعاد في الجسد عند السؤال	لوٹائی جاتی ہے۔ پس اعادۂ رُوح کا
فالجواب بانكار الاعادة	انکار کر کے معتزلہ کو جواب دینا

غیر موجه و قد اجاب المشائخ عن هذه الآیة بوجوه - (نبراس ص ٣٢٣)

ٹھیک نہیں۔ مشائخ نے ان کی پیش کردہ آیت کے اور کئی جواب دیئے ہیں۔

سائر الاحادیث الصحیحة المتواترة تدل علی عود الروح الی البدن اذا المسئلة للبدن بلا روح قول قاله طائفة من الناس وانکره الجمهور وکذالک السوال للروح بلا بدن قاله ابن میسرة وابن حزم ولو کان کذالک لم یکن للقبر بالروح اختصاص - شرح حدیث النزول للحافظ ابن تیمیه ص ٨٥

وهذا قول منکر عند عامة اهل السنة والجماعة -

(شرح حدیث النزول ص ٨٨)

واذا قبضت (الروح) عرج بها الی الله فی ادنی زمان ثم تعاد الی البدن فتسأل وهی فی البدن - (شرح حدیث النزول ص ٨٤)

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے بھی تحفۂ اثنا عشریہ میں "حیات فی القبر" کا حکمی ہونا روافض کے آیت مذکورہ سے استدلال کرنے کے جواب ہی میں تحریر فرمایا ہے۔ حق یہی ہے کہ محدثین کا مسلک اس باب میں بالکل بے غبار ہے[1] اور متکلمین بھی تحقیقاً انہی کے ساتھ ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی صورت جواب ہے وہ معتزلہ کے پیدا کردہ اشکالات کے پیش نظر ہے

---

[1] اس عقیدہ کی تائید میں کہ قبر کے سوال وجواب روح اور بدن کے مجموعہ سے متعلق ہیں۔ علامہ صدر الدین الحنفی کی یہ تصریح بھی ملاحظہ کیجیے:-

وکذلک عذاب القبر یکون للنفس والبدن جمیعاً باتفاق اهل السنة والجماعة تنعم النفس وتعذب مفردة عن البدن ومتصلة به - (شرح عقیدة الطحاوی ص ٣٠٣)-

جب جملہ اموات کے لیے اعادۂ روح ثابت ہے تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام کو کس دلیل کی بنا پر مستثنیٰ کیا جاتا ہے؟

علامہ سبکیؒ فرماتے ہیں :-

وعود الروح الی البدن ... . فی سائر الموتی فضلاً عن الشهداء فضلاً عن الانبياء وانما النظر فی استمرارها فی البدن۔

روح کا بدن میں پھر دوبارہ لوٹنا۔ یہ تو تمام اموات کے لئے ثابت ہے۔ شہدا اور انبیا پر تو بدرجۂ اولیٰ اس کا تحقق ہوگا، بحث صرف اس میں ہے کہ روح پھر بدن میں دائماً رہے گی یا پھر یہ تعلق ٹوٹے گا۔

(شفاء السقام ص۱۵۹)

احادیثِ شریفہ میں "حیات فی القبر" کے لئے اعادۂ روح تو نہایت صحیح اور متواتر المعنیٰ روایات سے ثابت ہے، لیکن قبر کی پہلی منزل گزرنے کے بعد بدن یا اجزائے بدن میں ادراک الم و لذت کا کچھ اثر چھوڑتے ہوئے یہ روح پھر نکل جاتی ہے یا وہیں استقرار پذیر رہتی ہے؟ یہ معاملہ غور طلب ہے۔

حافظ ابن قیمؒ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ سے نقل کرتے ہیں :-

قال شيخ الاسلام الاحاديث الصحيحة المتواترة تدل على عود الروح الى البدن وقت السوال۔ (ص۶۲)

احادیثِ صحیحہ متواترہ بتا رہی ہیں کہ سوالِ قبر کے وقت روح پھر بدن کیا لوٹائی جاتی ہے۔

قطع نی کنم بعودِ حیات مر ہر میت را چنانکہ در احادیث ورود یافتہ۔

(جذب القلوب ص۱۸۵)

اِس منزل کے بعد پھر روح رخصت ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں اور جملہ فرقِ اہلِ اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ عامۃ الاموات کے لئے اعادۂ روح کے ساتھ قبر کی زندگی ہمیشہ نہیں۔ عودِ روح تو احادیثِ صحیحہ صریحہ سے ثابت ہے لیکن پھر اس کی مفارقت؟ یہ امر اجماع اور تواتر طبقاتی سے منقول ہے، ہاں انبیائے کرام کے لیے یہ مفارقت قطعاً ثابت نہیں اور جس طرح عامۃ الاموات کے لیے اس مفارقت کا پتہ اجماع سے چلتا ہے۔ اسی طرح انبیاً کے لیے اس عدمِ مفارقت پر بھی اجماع اور تواتر طبقاتی قائم ہے۔ فافہم و تدبر۔

المبحث الرّابع

اعادۂ روح اور اتّصالِ روح میں موازنہ

حیات فی القبر کے لئے اعادۂ روح تو احادیثِ صحیحہ صریحہ سے ثابت ہے، اسی اصل کے مطابق انبیاء علیہم السّلام کے اجسادِ مطہرہ میں ارواحِ قدسیہ دوبارہ لوٹائی جاتی ہیں۔ صورتِ زیرِ بحث صرف یہ رہ جاتی ہے کہ جس طرح جملہ اموات کے لئے پھر روح کی مفارقت ہوتی ہے، کیا انبیاء علیہم السّلام کی ارواح قدسیہ بھی پھر معرضِ مفارقت میں آجاتی ہیں؟ اہلِ سنّت کے ہاں یہ مفارقت کہیں ثابت نہیں ہوتی۔

اتّصالِ روح کا موقف اثباتِ حیات کے باب میں اگرچہ نہایت کافی و وافی ہے اور اس صورتِ کیفیت میں بھی انبیاء علیہم السّلام کی اپنی اپنی قبروں میں حیاتِ عنصری جسمانی کی قطعاً نفی نہیں ہوتی، تاہم دیکھنا یہ ہے کہ اس صورتِ کیفیت کی اصل کیا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اتّصالِ رُوح کا موقف کسی نص صریح پر مبنی نہیں، بلکہ علمائے کبار نے مختلف نصوص میں تطبیق دینے کے لئے اسے اجتہادی طور پر اختیار کیا تھا۔ بعض مقامات پر ارواح قدسیہ کے اعلیٰ علیین میں ہونے کی خبر دی گئی تھی اور دوسری طرف انبیائے کرامؑ کے اپنی اپنی قبورِ شریفہ میں زندہ ہونے اور عند القبر خود سُننے کا صحیح روایات سے ثبوت ملتا تھا۔ اب بعض عُلماء کا ذہن بجائے اس کے کہ ابدانِ مطہرہ کو ارواحِ قدسیہ کا مستقر قرار دے کر اعلیٰ علیین سے ایک قوی تعلق ثابت کریں۔ اس لئے کہ ارواحِ قدسیہ وہاں سے ہو کر پھر ابدانِ مدفونہ کی طرف لوٹی تھیں، یہ تعبیر اختیار کر لی کہ مستقر ارواح مقام علیین کو قرار دے کر ابدان مدفونہ سے ایک قوی علاقۂ حیات تسلیم کر لیا۔

خلاصہ یہ کہ اعادۂ رُوح کا موقف من حیث الاصل احادیث صحیحہ صریحہ پر مبنی تھا اور اتّصالِ رُوح کا موقف علمائے کبار نے محض تطبیق بین الروایات کی خاطر اجتہادی طور پر اختیار کیا تھا۔ بیہقیِ وقت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ لکھتے ہیں :-

انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من صلی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ نائیا بلغتہ فکیف التطبیق؟ قلنا وجہ التطبیق ان مقر ارواح المؤمنین فی علیین او فی السماء السابعۃ ونحو ذالک کما مرّ ومقر ارواح الکفار فی سجین ومع ذالک لکل روح منہا اتصال بجسدہ فی قبرہ لا یدرک کنہہ الا اللہ تعالیٰ وبذالک الاتصال یصح ان یعرض علی الانسان المجموع المرکب من الجسد والروح مقعدہ من الجنۃ او النار ویحس اللذۃ والالم ویسمع سلام الزائر۔ (مظہری جلد ۱۰ ص ۲۲۴/۲۲۵ ہند)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میری قبر کے پاس آ کر مجھ پر درود پڑھے، اُسے میں خود سنتا ہوں اور دور کا پڑھا مجھے پہنچایا جاتا ہے (اور یہ بھی سابقاً گزرا کہ ارواحِ طیبہ علیین میں ہوتی ہیں)۔ پس دونوں مضمونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ ہم کہتے ہیں ارواحِ مؤمنین کا مقر تو علیین یا ساتویں آسمان ہی میں ہے، اسی طرح ارواحِ کفار مقامِ سجین میں ہی رہتی ہیں، لیکن ان حقائق کے باوجود ہر روح کا تعلق قبر میں پڑے جسد (یا اجزائے جسد) سے بھی ضرور ہوتا ہے اس تعلق کی پوری حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ ہاں رُوح کے جسد کے ساتھ اس طرح متصل ہونے سے ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ معاملات قبر رُوح و جسد کے مجموعہ سے ہوتے ہیں اور الم و لذت کا ادراک اسی طرح واقع ہوتا ہے۔

پس جبکہ اعادۂ رُوح کا موقف من حیث الاصل منصوص اور اتّصال رُوح کا موقف من حیث الاستدلال اجتہادی ہے، تو اگرچہ بہر صورت کیفیت قبر شریف کی حیاتِ عنصری جسمانی نہایت واضح طور پر ثابت ہے، تاہم اتّصالِ رُوح کا موقف اختیار کرنے سے نصوص پر اجتہاد کی ترجیح لازم آتی ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ جمہور محدثینؒ اور اکابر علمائے دیوبند اسی صورتِ کیفیتِ حیات کے قائل ہیں۔ جس کی اصل احادیثِ صحیحہ صریحہ پر مبنی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب!

مسلکِ اہلسنت از اکابرِ دیوبند

المعروف

اجماع العلماء الاعلام

علیٰ

حیاۃ الانبیاء الکرام

پیشتر اس کے کہ حیاتُ النّبیؐ کے باب میں ہم اکابرِ دیوبند کی تصریحات پیش کریں۔ ضروری ہے کہ پہلے اطلاق "مسلکِ دیوبند" کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔ معلوم رہے کہ دارالعلوم دیوبند کسی "مستقل مکتبِ فکر" کا بانی نہیں اور نہ مسلکِ اکابرِ دیوبند کی تاریخ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے، بلکہ تمام اکابر دیوبند انہی عقائد و افکار کے پابند رہے جو قرونِ ثلٰثہ مشہود لہا بالخیر سے "ما انا علیہ و اصحابی" کی مقدس وراثت کے طور پر چلے آ رہے تھے۔ دیوبندیت کسی مستقل مکتبِ فکر یا مسلک عمل کا نام نہ تھا، بلکہ سلفِ صالحین اہلِ تحقیق کی کامل اتباع اور انہی کی تعلیم و اشاعت اکابر دارالعلوم دیوبند کا طرّۂ امتیاز رہا ہے۔ یہ تمام حضرات عقائد میں اہلِ سنت والجماعت اور فروعات میں امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلکِ عمل پر تھے اور دارالعلوم دیوبند پورے ایشیا میں حنفی مسلکِ فکر کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

اچانک اُدھر سے تار ہلا اور جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب اوائل ۱۳۲۴ھ

میں ان بزرگوں کے خلاف ایک تکفیری دستاویز تیار کر کے حجاز پہنچ گئے ۔ تاکہ عُلمائے حرمین سے اس پر دستخط لینے میں کامیاب ہو سکیں ۔

کئی منزلیں گزرنے کے بعد معاملہ یہاں تک پہنچا کہ عُلمائے حرمین نے "موضوعاتِ زیرِ بحث" اکابرِ دیوبند سے خُود براہ راست ۲۶ استفسارات کیئے اور اُن کے عقائد و افکار کو اصُولِ اہلِ سُنّت پر جانچنے کی کوشش کی ۔

اس کے جواب میں اُس وقت کے اکابر دارالعلوم نے اپنا مسلک پیش کیا اور چھبّیس ۲۶ مفصّل جوابات کے ضمن میں اپنے عقائد و افکار یکجا قلمبند کر دیئے۔ اور اُس پر اپنی مُہریں ثبت کر دیں ۔ فخرالمحدّثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے انھیں لکھّا اور حضرت شیخ الہندؒ، مفتیِ اعظم دارالعلوم دیوبند، مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ، حکیم الاُمّت حضرت تھانویؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ جیسے سب بزرگوں نے اس پر تصدیقات تحریر فرمادیں اور فقط اعتماداً نہیں، بلکہ تحقیقاً سب جواب دیکھ کر ۔

چنانچہ مفتیِ اقلیمِ ہند حضرت مُفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

رایت الاجوبۃ کلھا فوجدتھا حقۃ صحیحۃ ۔

مَیں نے تمام جوابات خُود دیکھے ہیں اور اُنھیں حق صریح پایا ہے ۔

اِن عقائد پر پھر مکّہ معظّمہ، مدینہ منوّرہ، جامع ازہر، مصر و شام کے عُلمائے کبار (جن میں احناف و شوافع، موالک و حنابلہ مسالکِ اربعہ کے اکابر عُلما سب شامل تھے) سب نے اس پر تصدیقات فرمائیں اور یہ "المہند" نامی دستاویز عقائد عُلمائے دیوبند کے نام سے موسُوم ہُوئی ۔

اِس منزل سے گُزرنے کے بعد اکابرِ دیوبند کا مسلک ایک واضح مُعیّن اور مشخّص صُورت میں سامنے آگیا ۔ دیوبندیت کے ضابطہ تحریر میں آنے کے بعد

اب یہ امکان بھی باقی نہ رہا کہ کوئی شخص علمائے دیوبند کی طرف کسی ایسے عقیدے کو منسوب کرے، جو اکابر کی اس اجتماعی مسلکی دستاویز کے خلاف ہو اور نہ ہی یہ امکان باقی رہا کہ کوئی منسوب بہ دار العلوم افکار و آرا کے باہمی اختلاف میں اس مرکزی دستاویز سے کچھ تجاوز کر سکے۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اکابرِ دیوبند کے مسلک پر بھی کہے اور عقائد بھی اس کے اس "مرکزی مسلکی دستاویز" کے خلاف ہوں اور نہ صرف خلاف بلکہ رد و ابطال اس کے نزدیک جزوِ تبلیغ توحید ہو، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کذب و دجل اور دھوکہ و فریب آخر کس بلا کا نام ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس مرکزی مسلکی دستاویز کے علاوہ دیگر مسائل میں اختلاف خواہ وہ تعبیرات و توجیہات میں ہو یا فقہی جزئیات میں ترجیحات کے باب میں ہو یا تنظیماتِ عمل میں، اصل دیوبندیت کو ہرگز مشتبہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ دیوبندیت اکابرِ دیوبند میں سے کسی ایک شخصیت کا نام نہیں اور نہ دیوبندیت کا معیار اکابر میں سے کسی ایک بزرگ کی تقلیدِ شخصی ہے؛ بلکہ مسلکِ دیوبند کا مرکزی نقطہ "المہند علی المفند" ہے، جسے وقت کے تمام اکابرِ دیوبند اجماعاً "آئینۂ دیوبندیت" قرار دے چکے ہوئے ہیں۔

مسائلِ حدیث میں حضرت گنگوہی رح اور حضرت علامہ کشمیری رح کے اختلافات توجیہاتِ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ حضرت شیخ الہند رح اور حضرت تھانوی رح کے مختلف مواقفِ عمل سے کون واقف نہیں اور مختلف علمائے دیوبند کے مختلف نظریات بلکہ تفردات کس دور میں نہیں رہے۔ اکابر کی علمی تحقیقات کے ناپید اکنار سمندر اور تصنیفات کے ضخیم دفاتر اس حقیقتِ حال کے پُر زور ترجمان ہیں کہ اکابرِ دیوبند افکارِ شریعت اور اسرارِ کتاب و سنت کی تعلیم و تفہیم میں ہمیشہ دقیق النظر اور عمیق الفکر

رہے ہیں اور اُنھوں نے اپنی روایتی وسیع النّظری کو کبھی گروہی تعصّب یا دھڑے بندی کی نذر نہیں کیا - فجزاہم اللہ احسن الجزاء -

افکار و آراء کے ان اختلافات میں کبھی ایک طبقے نے دُوسرے کی دیوبندیت کو شبہے کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی سُنا گیا کہ عُلما کا فُلاں طبقہ مسلکِ دیوبند سے ہٹ گیا ہے - اس لئے کہ ایسے تمام اختلافات اور ایسے تمام مختلف نظریات اِن ابواب میں تھے، جو مسلکِ دیوبند کی مرکزی مسلکی دستاویز "المھند علی المفند" سے کسی طرح متصادم نہ ہوتے تھے - مسلکِ دیوبند کے خدوخال جس آئینے میں مشخص یا معیّن ہوتے تھے، وہ بلا ریب اکابرِ دیوبند کی اجماعی تحریر "المھند علی المفند" ہی تھی - مسلکِ دیوبند کی حدود باعتبارِ کمیّت کبھی بھی "المھند" سے متجاوز نہیں ہوئی - ہاں باعتبارِ کیفیت یعنی قوّت و ضعف کے درجہ میں اس معیار کو بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے، جو مجاہدِ کبیر حضرت مولانا عبید اللہ سندھی سے منسوب ہے، لیکن پیشِ نظر رہے کہ یہ کوئی اجماعی فیصلہ نہیں، بلکہ ایک شخصی رائے ہے -

مسئلۂ حیات النّبیؐ کا مدار اگر صرف "آپ حیات" پر ہوتا تو اس سے اختلاف مسلکِ دیوبند سے خروج نہ تھا، اس لئے کہ دیوبندیت کوئی مستقل مکتبِ فکر نہیں اور نہ حضرت نانوتوی کسی علیحدہ مکتبِ فکر اور مسلکِ عمل کے بانی تھے، بلکہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد جس اصول پر رکھی، وہ سلف صالحین اہلِ سُنّت کی اعتقاداً اور عملاً کامل اتباع ہی تھی - ان اکابر سے کسی ایک مسئلہ میں اختلاف بہ صورتِ فکر تو پیش کر سکتا تھا کہ جانبِ مخالف اہلِ سُنّت سے خروج ہے یا یہ اختلاف حدودِ اہلِ سُنّت میں بھی سمو سکتا ہے؛ لیکن یہ بحث ہرگز نہ چل سکتی تھی کہ یہ مسلک دیوبند سے خروج ہے یا نہیں، اس لئے کہ دیوبندیت حضرت

نانوتویؒ یا حضرت گنگوہیؒ کی تقلیدِ شخصی کا نام ہرگز نہیں۔

دیوبند سے قریبی تعلق رکھنے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ مسئلہ حیات النبی ﷺ میں مسلکِ دیوبند کا مدار صرف آبِ حیات پر نہیں، بلکہ "المهند" کی اجماعی مسلکی دستاویز پر ہے پس اس سے اختلاف یقیناً مسلکِ دیوبند سے خروج اور دیوبندیت سے ہٹ جانا ہے ورنہ ان تمام اکابر کی تکذیب لازم آتی ہے جنھوں نے المهند کو آئینۂ دیوبندیت قرار دیا تھا اور ان تمام بزرگوں کی بھی تجہیل ہوتی ہے جو اسے دوسروں کے سامنے دیوبندی مسلکِ فکر کے ترجمان کی صورت میں پیش کرتے رہے۔

مسئلۂ زیرِ بحث میں مسلکِ دیوبند تو المهند سے ہی پوری طرح عیاں ہے تاہم اکابرِ مسلکِ دیوبند کی علیحدہ علیحدہ تصریحات بھی تائیداً پیشِ خدمت ہیں۔ انھیں مرحومین اور موجودین کی ترتیب سے ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے :-

مرحومین :-

(۱) حجۃ اللہ علی العالمین، مرکزِ دائرۃ التحقیق قطبِ افلاکِ اسرار التشریع، حضرت مولانا الشیخ محمد قاسم النانوتوی الصدیقی، انار اللہ برہانہ :-

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے حسبِ ارشاد حضرت امام ربانی، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایک کتاب "ہدیۃ الشیعہ"[1] تحریر فرمائی تھی۔ آپؒ اس میں رقمطراز ہیں:

---

[1] ہدیۃ الشیعہ اور ہدایۃ الشیعہ دو علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں۔ اول الذکر حضرت نانوتویؒ کی تصنیف ہے اور ثانی الذکر حضرت گنگوہیؒ کی ——— مولانا نانوتویؒ کی کتاب بھی دراصل حضرت گنگوہیؒ کی ہی تحریک پر لکھی گئی تھی یہ آبِ حیات سے بہت پہلے کی تصنیف ہے۔ حضرت مولانا نانوتویؒ آبِ حیات میں لکھتے ہیں۔
"ارشاد حضرت مجموعہ علم و عمل جامع کمالات عیانی و نہانی عالم ربانی مولانا رشید احمد صاحب خلیفہ ارشد حضرت پیر و مرشد ادام اللہ فیوضہم باعث تحریر اصل رسالہ یعنی ہدیۃ الشیعہ ہوا تھا" (آبِ حیات ص ۵ مطبع مجتبائی) ہدیۃ الشیعہ میں حیات النبی کے مضمون کا ہونا ان لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو اسے محض حضرت نانوتویؒ کی افتادِ طبع قرار دیتے ہیں اور اسے ان کے تفرد پر محمول کرتے ہوئے حضرت گنگوہیؒ کو اس سے بالکل لاتعلق قرار دیتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ ہدیۃ الشیعہ (حیات النبی کے بیان پر حضرت نانوتویؒ کی پہلی تصنیف) کے محرک ہی حضرت گنگوہی تھے۔ فافہم و تدبر۔

"رسول اللہؐ بلکہ تمام انبیاءؑ بالیقین قبر میں زندہ ہیں، تو اس صورت میں آپؐ کی ملک زائل ہونے ہی نہیں پائی، جو وارثوں کی ملک اس کے قائم مقام ہو، بلکہ جیسے ہم تم کہیں چلے جائیں یا جیسے کسی گوشہ میں بیٹھ رہیں اور ہمارے لواحق وغیرہ ہماری اشیاء کو برتیں اور اس سے ہماری ملک زائل نہیں ہوتی اور برتنے والے یا وارث مالک نہیں بن جاتے۔ ایسے ہی رسول اللہؐ بھی گوشۂ قبر میں پنہاں ہو گئے اور آپؐ بدستور اپنے اشیاء اموال کے مالک۔ کوئی اور مالک نہیں ہو گیا! اور حدیث لا نورث ما ترکناہ صدقۃ جو ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے اس حدیث کی لِم بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ اب تک بقید حیات ہیں۔ پر شیعہ نہ سمجھیں تو کیا کیجیے"۔ (ہدیۃ الشیعہ ص ۲۶۸/۲۶۹ از حضرت نانوتویؒ)

پھر حضرت نانوتویؒ لطائف قاسمیہ میں لکھتے ہیں:-

"انبیاء کرامؑ کو انہیں اجسام دنیاوی[1] کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں"۔ (لطائف قاسمیہ ص ۳)

اصل مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک محقق[2] ہو گئی۔ یوں کوئی منکر نہ مانے

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نانوتویؒ اور علماء دیوبند بھی آنحضرتؐ کی اس عالم برزخ کی حیات کو دنیاوی حیات کہتے ہیں اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ حیات برزخی اسی دنیاوالے جسد اطہر سے متعلق ہے نہ یہ کہ وہ حیات بعینہٖ الوجوہ دنیاوی حیات ہے۔ جب حضرت نانوتویؒ حیات دنیاوی کے مفہوم اور اس کی حدود کو خود واضح فرما رہے ہیں کہ وہ تعینہاً اس دنیاوالی حیات نہیں بلکہ حیات دنیوی کا اطلاق محض ابدان دنیوی میں زندگی ہونے کے اعتبار سے ہے۔ تو کس قدر مغالطہ دہی ہے کہ اس حیات دنیوی کے ابطال کیلئے ان آیات اور روایات کا سہارا لیا جاتا ہے جن میں اس عالم دنیا کی حیات اور اس کے مطلوب و محبوب نہ ہونے کا بیان ہے جو لوگ اس مغالطہ دہی کے سہارے علماء دیوبند کے خلاف یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ وہ آنحضرتؐ کو اسی عالم دنیا میں زندہ سمجھتے ہیں اور انتقال دار من الدار کے قائل نہیں انہیں حضورؐ کا یہ ارشاد پیش نظر رکھ کر کہ آپ نے مغالطے ڈالنے سے منع فرمایا ہے اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔ واللہ ہو الموفق۔

[2] اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نانوتویؒ حیات النبی کے مضمون کو محض الزامی طور پر بیان نہیں کر رہے بلکہ اس کا حق ہونا حضرتؒ کے نزدیک محقق ہے۔ یوں کوئی منکر نہ مانے تو وہ جانے افسوس کہ اس باب میں بھی مغالطہ دہی سے کام لیا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے کہ حیات النبی حضرتؒ کا اپنا عقیدہ نہ تھا بلکہ آپ نے اسے محض الزامی طور پر تردید شیعہ کے لئے بیان کیا تھا۔ رب العزت تقیہ کی تہمت سے محفوظ رکھے۔

تو وہ جانے۔ منکروں کا کام یہی ہے"۔ (آبِ حیات صـ۳۵)

پھر لکھتے ہیں :۔

"انبیاءؑ کو ایمان دُنیا کے حساب سے زندہ سمجھیں گے پر حسب ہدایت کل نفس ذائقۃ الموت اور انک میت و انہم میتون تمام انبیاے کرامؑ علیہم السلام خاص کر حضرت سرورِ انام صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت مُوت کا اعتقاد[1] بھی ضروری ہے"۔ (لطائفِ قاسمیہ صـ۴)

حضرت نانوتویؒ ایک دُوسرے مقام پر انبیاے کرامؑ علیہم السلام کے لئے ورُودِ مَوت کا اِقرار ان لفظوں میں کرتے ہیں :۔

"بالجملہ مَوتِ انبیاءؑ اور موتِ عوام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہاں استتارِ حیات زیرِ پردہ مُوت ہے اور یہاں انقطاعِ حیات بوجہِ عرُوضِ مَوت ہے۔ اگر موت ضدِ حیات اور صفت وجُودی ہو یا بوجہِ دیگر اگر موت عدم اور ملکۂ حیات ہو اور شاید یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جنابِ باری نے حضرت سرورِ عالمؐ کو جُدا خطاب کر کے ارشاد فرمایا: "انک میت" اور سوا آپ کے اوروں کو بھی جُدا ارشاد فرمایا: "انہم میتون" اور مثلِ جملۂ لاحقہ "ثم انکم یوم القیٰمۃ عند ربکم تختصمون" سب کو شامل کر کے یُوں ارشاد نہ فرمایا کہ انکم میتون۔ بالجملہ جیسے حیاتِ نبویؐ اور حیاتِ مؤمنینِ اُمّت میں فرق ہے۔ چنانچہ اُس کے اثبات کے لیے تقریر وافی

---

[1] حضرت کی یہ تصریح ان لوگوں کے منہ پر ایک عبرتناک طمانچہ ہے جو یہ پراپگنڈہ کر رہے ہیں کہ حضرت نانوتویؒ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضور پر ورود موت ہوا ہی نہیں اور وہ حضور کے لیے کسی قسم کی وفات بھی نہیں مانتے یہ حضرت پر ایک بہتان عظیم ہے ثانیاً اس عبارت سے منکرین حیات کا یہ پراپیگنڈہ بھی بے غبار ہو گیا کہ وفات النبی کی یہ مذکورہ آیات حضرت نانوتویؒ کو یاد نہ تھیں یا بیان حیات النبی کے وقت مستحضر اور سامنے نہ تھیں۔

اور تحریر شافی کافی اوراقِ گزشتہ میں گزر چکی ہے۔ ایسے ہی موتِ نبوی اور موتِ مومنین میں بھی فرق ہے اور وجہِ فرق بین المومنین وہی فرق بین الحیاتین ہے اور اسی بناء پر لازم ہے کہ نومِ نبوی اور نومِ مومنین میں فرق ہو۔ اس لئے کہ النوم اخو الموت چنانچہ خداوند کریم نے بھی اپنے کلام پاک میں موت اور نوم کو ایک سلک میں کھینچا ہے اور ایک ذیل میں داخل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا[1]۔

جب دونوں کی حقیقت توفی اور امساک ہوئی۔ چنانچہ ارسال کا تقدم امساک پر دال ہے۔ جیسے موت تقدم حیات پر دلالت کرتی ہے، تو پھر جو حال وقت امساک موت ہوگا وہی حال وقت امساکِ نوم ہوگا۔ جس کی موت کے وقت استتارِ حیات ہوگا، اس کی نوم کے وقت بھی استتار ہی ہوگا۔ فرق ہو تو شدتِ استتار وضعفِ استتار ہو۔۔۔۔۔۔ چنانچہ آں حضرتؐ کا کلام اس ہیچمدان کی تصدیق کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

تنام عیناى ولا ینام قلبی او کما قالؐ (میری صرف آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سوتا۔ رواہ البخاری ومسلم بالفاظِ مختلفہ)"۔

(آبِ حیات ص ۲۱۹/۲۲۰ مجتبائی)

---

[1] فیمسك التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخریٰ الی اجل مسمی۔ پ ۲۴ زمر، یعنی اللہ تعالیٰ جانوں کو قبض کرتا ہے موت کے وقت بھی اور نیند کے وقت بھی پھر انھیں انکے متعلق روک رکھتا ہے جنکی موت کا فیصلہ ہو چکا اور دوسری جانوں کو پھر لوٹا دیتا ہے کچھ مدت تک کیلئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بغوی نے نقل کیا ہے کہ نیند میں روح نکل جاتی ہے مگر اس کا مخصوص تعلق بدن سے بذریعہ شعاع کے رہتا ہے جس سے حیات باطل نہیں ہوتے پاتی (جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیند میں بھی وہی چیز نکلتی ہے جو موت کے وقت نکلتی ہے لیکن تعلق کا انقطاع ویسا نہیں ہوتا جو موت میں ہوتا ہے (فوائد القرآن للشیخ العثمانی ص ۶۰۶) اب انبیاء کرام سے نیند کیوقت ابھی روح نہیں نکلتی اسی حقیقت موت پر بھی غور کرلو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت نانوتوی رحؒ نے "آبِ حیات" کو "تقریرِ ابوثبتِ نبوی"[1] تک پہنچ کر پھر حضرتِ گنگوہی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ خود لکھتے ہیں :-

"بغرضِ اطمینان وتصدیق[2] مولانا و مخدومنا رونقِ طریقت زیبِ شریعت مولانا رشید احمد گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ وادام فیوضہ کی خدمت میں عرض کی"۔ (آبِ حیات ص۲۰۷)

اسی کتاب "آبِ حیات" کے پہلے ورق پر ہی مرقوم ہے :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز قبر میں زندہ ہیں اور مثل گوشہ نشینوں اور چلہ کشوں کے عزلت گزیں ہیں، جیسے اُن کا مال قابلِ اجرائے حکمِ میراث نہیں ہوتا، ایسے ہی آپ کا مال بھی محلِ توریث نہیں"۔ (آبِ حیات ص۲)

پھر فرماتے ہیں :-

"ارواحِ انبیاءؑ کو بدن سے علاقہ بدستور رہتا ہے۔ ہر اطراف وجوانب سے سمٹ آتی ہے"۔ (جمالِ قاسمی ص۱۲)

پھر لکھتے ہیں :-

"سماعِ انبیاء علیہم السلام بعدِ وفات زیادہ تر قرینِ قیاس ہے اور اسی لیے اُن کی زیارت بعدِ وفات بھی ایسی ہی ہے جیسے ایامِ حیات میں "احیاء" کی زیارت ہوا کرتی ہے"۔ (جمالِ قاسمی ص۱۶ ۔ اعزازیہ دیوبند)

---

[1] تسمیہ تقریر ثبوت نبوی آبِ حیات ص۱۲، ص۷، ص۱۰۸، ص۱۴۷، ص۱۹۵ بلکہ اس کے آگے تک تحقیق کی گئی ہے۔

[2] حضرت گنگوہیؒ کی تصدیق ان کی اپنی کتاب ہدایۃ الشیعہ میں بھی مرقوم ہے، فرماتے ہیں "اس مضمون حیات کو بھی مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ "آبِ حیات" میں بما لا مزید علیہ ثابت کیا ہے"۔ ص۱۸، مطبع مجتبائی۔ حضرت گنگوہیؒ کے اس ارشاد میں "مالا مزید علیہ" (کہ اس پر اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا) کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی "آبِ حیات" کے متعلق فرماتے ہیں :- "مولانا گنگوہی قدس سرہ "ہدایۃ الشیعہ" اور رسالہ "حج" وغیرہ میں بھی اس کی تصریح و تائید فرماتے ہیں۔ (الشہاب الثاقب ص۴۵، برقی پریس دہلی)۔

(۲) فخر المحدثین قطب الارشاد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ :-

"ولان النبیین صلوات اللہ علیہم اجمعین لما کانوا احیاء فلا معنی لتوریث الاحیاء منہم"[1] (الکوکب الدری جلد ۱ ص ۴۲۳)

ترجمہ: "چونکہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰت سب کے سب زندہ ہیں۔ اس لیے ان کے آگے وراثت چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

پھر فرماتے ہیں :-

"آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں" "ونبی اللہ حی یرزق"[2] اس مضمون حیات کو بھی مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ "آب حیات" میں بمالا مزید علیہ ثابت کیا ہے۔" (ہدایۃ الشیعہ ص ۱۸ مجتبائی)

پھر ارشاد فرماتے ہیں :-

"(کسی) قبر کے پاس جا کر کہے کہ اے فلاں! تم میرے واسطے دعا کرو کہ حق تعالیٰ میرا کام کر دیوے، اس میں اختلاف علماء کا ہے۔ مجوز سماع موتیٰ اس کے جواز کے مقر ہیں اور مانعین سماع منع کرتے ہیں، سو اس کا فیصلہ اب کرنا محال ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی[3] کو خلاف نہیں۔ اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے اور دلیل جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعت مغفرت کا عرض کرنا لکھا[4] ہے۔ پس یہ جواز کے واسطے

---

[1] شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری دامت برکاتہم حضرت گنگوہیؒ کی اس حیات النبی کی تقریر کے متعلق لکھتے ہیں:- تقریرًا انیقًا ینبغی ان یکتب بماء الذہب۔ (اوجز المسالک جلد ۶ ص ۴۸۲)

[2] سنن ابن ماجہ ص ۱۱۹۔

[3] معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ کے اپنے روضۂ اطہر میں خود سماعت فرمانے پر پوری امت کا اجماع ہے اور اس کا منکر پورے اجماع امت کا منکر ہے۔

[4] ثم یسئل النبی الشفاعۃ فیقول یا رسول اللہ اسألک الشفاعۃ۔ (فتح القدیر آخر کتاب الحج جلد ۲، ص ۳۳۷ مصر)۔

کافی ہے"۔ (فتاوٰے رشیدیہ جلد ۱ ص ۹۹/۱۰۰)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری دامت برکاتہم حضرت گنگوہیؒ کا مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر[1] فرماتے ہیں :-

"حضرت مفتی عزیز الرحمٰن[2] صاحب مفتی اعظم دار العلوم نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے "اِنَّكَ مَيِّتٌ" الآیۃ کے اشکال کا جو جواب نقل کیا ہے، وہ تو حضرت نانوتوی قدس سرہ کی تعبیر سے بھی بہت اونچا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ موت سب کو شامل ہے مگر انبیائے کرامؑ کی ارواح مشاہدۂ جمال و جلالِ حق تعالیٰ شانہٗ و تقابلِ آفتابِ وجودِ باری تعالیٰ سے اس درجہ پہ پہنچ جاتی ہیں کہ اجزائے بدن پر ان کا یہ اثر ہوتا ہے کہ تمام بدن حکمِ روح پیدا کر لیتا ہے اور تمام جسم ان کا عینِ ادراک اور عینِ حیات ہو جاتا ہے اور یہ حیات دوسری قسم کی ہوتی ہے اور اس تحقیق سے نکتہ ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء اور بھی ظاہر ہو جاتا ہے"۔ انتہیٰ کلامہ الشریف۔

(۳) رئیس المحققین، زبدۃ المحدثین شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ :

"المہند علی المفند" میں پانچویں سوال کے جواب میں لکھا ہے :-

"عندنا وعند مشائخنا حضرت الرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم حيّ في قبره الشريف وحيوته صلى الله عليه وسلم دنيوية من غير تكليف .... ان حيوته دنيويه برزخية لكونها في عالم البرزخ"۔ (ص۱۳ اعزازیہ دیوبند)

---

[1] حضرت شیخ الحدیث کا پورا بیان آگے آ رہا ہے۔ یہاں صرف حضرت گنگوہیؒ کا مسلک پیش کرنا مقصود تھا۔ اس لیے اس پر کفایت ہے۔

[2] حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا مسلک بھی اس نقل سے واضح ہو گیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

اس پر حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں :۔

ھو معتقدنا و معتقد مشائخنا جمیعًا لاریب فیہ۔ (المہند ص۴۶)

ہمارا اور ہمارے مشائخ کا یہی عقیدہ ہے اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے تصحیح کردہ ابوداؤد کے حاشیہ ص۱۵۷ میں ہے :۔

ان العرض ھل ھو علی الروح المجرد او علی المتصل بالجسد حسبوا ان جسد النبیؐ کجسد کل احد فکفی فی الجواب ما قالہ علی وجہ الصواب۔ (ص۱۵۷)

وفاتِ شریفہ کے بعد حضورؐ پر درود شریف کیا صرف رُوحِ مجرد پر پیش ہوا کرے گا یا رُوحِ متصل بہ جسد پر اس کا عرض ہو گا؟ حضورؐ کا جواب کہ انبیاء کرامؑ کے اجسادِ مطہرہ مٹی نہیں ہوتے، اس سوال کیفیت کا کافی جواب تھا۔

۴۔ فخر المحدثین زبدۃ العارفین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ :۔

ان نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حيٌّ فی قبرہ کما ان الانبیاء علیھم السلام احیاء فی قبورھم ولا فرق بین ان یکون فوق الارض او تحت حجابھا کما لا فرق فی حضورہ وغیبتہ فی زمان حیاتہ و لھذہ العلۃ لم یذھب الیہ

یقیناً نبی کریمؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں جیسے کہ سب انبیاء کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ زمین کے اوپر دکھائی دیں یا پردۂ زمین میں استراحت فرما ہوں (وہ زندہ یقیناً ہیں) جیسے کہ آپؐ کی اس دنیا کی زندگی میں آپؐ کے حاضر ہونے یا غائب ہونے میں (زندہ ہونے کے اعتبار سے)

احد من الائمۃ۔ | کوئی فرق نہ تھا۔

بذل المجہور جلد ۲ ص۱۱۷

پھر لکھتے ہیں:۔

ان الانبیاء فی قبورھم احیاء۔ (بذل جلد ۲ ص۱۲۶) | یقیناً انبیاء کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

رأس الاتقیاء حضرت مولانا خلیل احمد صاحب پر اس یقین کی کیفیت اس طرح غالب تھی کہ سامنے اس کا انکشاف ہو رہا تھا۔ تذکرۃ الخلیل میں ہے:۔

""آستانہ محمدیہ پر حضرت کی عجیب کیفیت ہوتی تھی آواز نکالنا تو کیا مواجہہ شریفہ کے قریب یا مقابل بھی آپ کھڑے نہیں ہوتے تھے، خوفزدہ مؤدبانہ دبے پاؤں آتے اور مجرم و قیدی کی طرح دور کھڑے ہوئے بکمال خشوع صلوٰۃ وسلام عرض کرتے اور چلے آتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ آں حضرت حیات ہیں۔ لہٰذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہیے۔ مسجد نبوی کی حد میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے، اس کو حضرت خود سنتے ہیں"۔

(تذکرۃ الخلیل ص۳۰۶)

پھر لکھتے ہیں:۔

عندنا وعند مشائخنا حضرۃ الرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم حیٌّ فی قبرہ الشریف وحیوتہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیویۃ من غیر تکلیف...... فثبت بھذا ان حیوتہ	ہمارا اور ہمارے سب مشائخ کا عقیدہ یہی ہے کہ حضورؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات (اس دنیا والے جسدِ اطہر میں ہونے کے اعتبار سے) دنیاوی ہے، ہاں (بجمیع الوجوہ دنیاوی نہیں) اس میں آپ مکلف بالاحکام

دنیویة برزخیة لکونها فی عالم البرزخ۔
(المهند ص۱۳ اعزازیة)

نہیں۔ پس آپ کی حیات اس طرح دُنیاوی اور عالمِ برزخ میں ہونے کے لحاظ سے برزخی ہے۔

۵۔ شیخ الاتقیاء زبدۃ الصلحاء حضرت مولانا الحاج الحافظ الشاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری رح۔

حضرت رائپوری قدس سرہ العزیز مذکورۃ الصدر "المہند علی المفند" (جس کی عبارت دربارۂ حیات النبی ؐ اُوپر ہدیۂ قارئین ہو چکی ہے) کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

الذی کتب فی هٰذه الرسالة حق صحیح وثابت فی الکتب بنص صریح وهو معتقدی ومعتقد مشائخی رضوان الله علیهم اجمعین احیانا الله بها واماتنا علیها وانا العبد الضعیف عبد الرحیم عفی عنه الرائیفوری۔
(المهند ص۴۸)

جو کچھ اس رسالہ "المہند" میں لکھا ہے حق اور صحیح ہے اور کتابوں میں نصِ صریح کے ساتھ موجود ہے۔ یہی میرا عقیدہ ہے اور یہی میرے مشائخ کا عقیدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسی عقیدے کے ساتھ زندہ رکھے اور اسی عقیدے پر ہمیں موت دے۔ مَیں ہوں بندۂ ضعیف عبدالرحیم عفی عنہ رائپوری۔

۶۔ امامِ کبیر محدثِ شہیر حضرت مولانا العلامۃ الشیخ امام انور شاہ کشمیری رح:۔

یرید بقوله الانبیاء احیاء مجموع الاشخاص لا الارواح فقط۔ (نخبة الاسلام ص۳۶)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کہ "انبیاءِ کرام زندہ ہوتے ہیں" کا مطلب یہ نہیں کہ فقط ان کی ارواح

زندہ ہیں، بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اشخاصِ انبیاء (روح و بدن کے) مجموعہ کے ساتھ زندہ ہیں"۔

پھر لکھتے ہیں:۔

المراد بحدیث الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلّون انھم ابقوا علیٰ ھٰذہ الحالة ولم تسلب عنھم فلا یرد ان الروح بنفسه یستطیع الصلوٰة ورد السلام فکیف وجه فی الحدیث بقاء الحیٰوة بفعل الصلوٰة و کذا رد السلام برد الروح۔ (تحیة الاسلام ص۳۶)	"انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازوں میں مشغول ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ انبیائے کرامؑ اسی حالت (اشتغال باعمالِ طیبہ) پر باقی رکھے گئے ہیں اور (فائز الحیات ہوکر اشتغال باعمالِ طیبہ کی) یہ کیفیت ان سے سلب نہیں کی گئی۔ یہ خیال نہ ہو کہ روح اکیلی ادائے نماز اور جوابِ سلام کی استطاعت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا، تو حضورؐ نے حیات النبیؐ

کے ساتھ ان کے فعلِ نماز کو اور روح لوٹنے (متوجہ ہونے) کے ساتھ جوابِ سلام کو وابستہ نہ فرمایا ہوتا"۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

قوله فنبی اللّٰه حیّ یرزق واحیاء فی قبورھم یصلّون تسرد فی ذکر الحیٰوة افعالها لا اصلها او اراد مع الاجساد فان اجسادھم حرمت علی	حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ کا نبیؐ زندہ ہوتا ہے اور اُسے رزق بھی ملتا ہے اور یہ کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ یہ احادیث صرف حیات کا بیان نہیں

الارض۔ (تحیۃ الاسلام ص۳۶ مصنفہ علامہ انور شاہؒ) کرتی ہیں بلکہ افعالِ حیات (زندوں والے کاموں کو) بھی ثابت کرتی ہیں یا یوں کہیے کہ انبیاے کرام کے اجسادِ مطہرہ مٹی پر حرام کر دیے گئے ہیں۔

۷۔ حکیم الامت، مجدد الملت، محی السنۃ الغراء، قامع البدعۃ الظلماء حضرتِ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ :۔

"حضرتِ ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاءؑ کے جسد کو کھا سکے۔ پس خدا کے پیغمبرؑ زندہ ہوتے ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ روایت کیا اس کو ابنِ ماجہؒ نے۔ ف پس آپؐ کا زندہ رہنا بھی قبر شریف میں ثابت ہوا اور یہ رزق اس عالم کے مناسب ہوتا ہے اور گو شہداء کے لیے بھی حیات اور مرزوقیت وارد ہے، مگر انبیاء علیہم السلام میں ان سے اکمل واقوی ہے۔ بیہقیؒ وغیرہ نے حدیث انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ کذا فی المواہب اور یہ نماز تکلیفی نہیں، بلکہ تلذذ کے لیے ہے اور اس حیات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپؐ کو ہر جگہ سے پکارنا جائز ہے۔"

(نشر الطیب ص۲۵۷-۲۵۸ شائع کردہ ادارۂ اشرفیہ، لاہور)

"ندا کا شبہ یہاں بھی نہ کیا جائے۔ دو وجہ سے۔ ایک تو تبادر قصہ سے یہ ہے کہ مسجد نبوی میں جانے کو فرمایا، سو وہاں حضورؐ قریب ہی تشریف رکھتے ہیں، ندا غائب لازم نہیں آتی۔" (نشر الطیب ص۲۱۴)

"شہداء کو احیاء کہا گیا اور ان کو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی اور یہی حیات ہے، جس میں حضرات انبیاءؑ شہداء سے

بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعد موت ظاہری کے سلامت جسد کے ساتھ ایک اثر اس حیات کا اس عالم کے احکام میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مثل ازواجِ احیاء کے ان کی ازواج سے کسی کا نکاح جائز نہیں ہوتا اور ان کا مال میراث میں تقسیم نہیں ہوتا"۔ (بیان القرآن جلد ا صفحہ ۴۹ تاج کمپنی)

پھر فرماتے ہیں :۔

"آپ بنص حدیث قبر میں زندہ ہیں"۔ (المکشف صفحہ ۴۴۶)

"مدینۂ منورہ جانے والا .... یوں کہے کہ میں نے حضورؐ کی زیارت کی کیونکہ حضورؐ زندہ ہیں"۔ (وعظ التبلیغ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۷ھ)

۸ ۔ رئیس المتکلمین، خاتم المحققین، محدث کبیر، شیخ الاسلام، حضرت مولانا العلامہ شبیر احمد عثمانی" :۔

الانبیاء احیاء عند ربھم یرزقون ۔ (فتح الملہم جلد ا صفحہ ۳۳۰)	انبیائے کرام اپنے پروردگار کے ہاں زندہ ہیں اور انہیں رزق بھی ملتا ہے ۔
ان النبیؐ حی کما تقرر و انہ یصلی فی قبرہ باذان واقامۃ ۔ (فتح الملہم جلد ۳ صفحہ ۱۹)	بے شک حضورِ اکرمؐ زندہ ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ اپنی قبر شریف میں اذان و اقامت سے نمازیں پڑھتے ہیں ۔
اما بعد وفاتہ فروحہ المقدسۃ صلی اللہ علیہ وسلم قد استقرت فی الرفیق الاعلی مع ارواح الانبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام ولا یتوھم من ھذا انکار حیاتہ فی قبرہ	وفات شریفہ کے بعد آپ کی روح مقدسہ دوسرے انبیاء کی ارواحِ طیبہ کے ساتھ رفیقِ اعلیٰ میں استقرار پذیر ہے ۔ لیکن اس سے آپ کے اپنی قبر شریف میں زندہ نہ ہونے کا وہم نہ کیا جائے ۔ کیونکہ آپؐ کی روح اقدس قبر میں رکھے بدن پاک

الشریف فان لروحه صلی الله علیه وسلم اشرافاً علی البدن المبارك المطیب واشراقاً و تعلقاً به وبدنه فی ضریحه غیر مفقود واذا سلم علیه المسلم رد الله علیه روحه[1] حتی یرد علیه السلام کما ورد فی الحدیث ولم یفارق الملأ الاعلیٰ ومن کثفادرکه وغلظت طباعه عن هذا الادراك فلینظر الی الشمس فی علو محلها۔ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۲۱)

پر اپنا اثر ڈال رہی ہے۔ اس کی اس پر روشنی پڑ رہی ہے اور اس کا بدنِ اطہر کے ساتھ تعلق قائم ہے۔ آپ کا بدنِ مبارک قبرِ مبارک سے ہرگز غائب نہیں[2] ہوا اور جب بھی کوئی مسلمان آپ پر سلام عرض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روحِ اقدس کو آپ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ اس کے باوجود آپ ملاءِ اعلیٰ اعلیٰ علیین سے جدا نہیں ہوتے ہیں کہ ادراک کثیف ہو اور اس کی فطرت ایسے حقائق کے ادراک کرنے میں غلیظ ہو، اسے سورج کو اس کے علوِ محل میں دیکھنا چاہیے۔

۹۔ محدثِ شہیر مجاہدِ کبیر، عمدۃ الفقہاء، رأس الاتقیاء، مفتیِ اقلیمِ ہند، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رح :۔

حضرت مفتیِ اعظم "المہند" (جس میں مسئلہ حیات النبی ایک مستقل سوال اور جواب کی صورت میں مرقوم ہے) اس پر لکھتے ہیں :۔

---

[1] قال شیخ الاسلام المراد بقول رد الله علی روحه کانت سابقة عقب دفنه لا انها تعاد ثم تنزع ثم تعاد کما فی الفتح ص ۳۳۳۔

[2] جیسا کہ علامہ قونوی کی رائے ہے۔ والتفصیل فی جذب القلوب۔

رأيت الأجوبة كلها فوجدتها[1] حقة صريحة لا يحوم حول سرادقاتها شك ولا ريب وهو معتقدي ومعتقد مشائخي۔ (المہند ص۵۲ اعزازیہ)

میں نے تمام جوابات[1] خود دیکھے ہیں اور انھیں حق صریح پایا ہے۔ کوئی شک یا ریب اس کے ارد گرد بھی نہیں گھوم سکتا۔ یہی میرا عقیدہ ہے اور میرے سب مشائخ بھی انہی عقائد پر تھے۔"

۱۰۔ رئیس المحدثین، امام المجاہدین، شیخ الاسلام والمسلمین، استاذ الہند والحجاز، حضرت مولانا السید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ اسرارہم۔

"نجدی[2] اور اس کے اتباع کا اب تک یہی عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات فقط اسی زمانے تک ہے جب تک وہ دنیا میں تھے۔ بعد ازاں وہ اور دیگر مؤمنین موت میں برابر ہیں۔ اگر بعد وفات ان کو حیات ہے تو وہی حیات برزخ ہے جو احادِ امت کو ثابت ہے۔ بعض ان کے حفظِ جسدِ نبی کے قائل ہیں مگر بلا علاقہ روح اور متعدد لوگوں کی زبان سے بالفاظ کریہہ کہ جن کا زبان پر لانا جائز نہیں۔ دربارہ حیاتِ نبوی علیہ السلام سنا جاتا ہے اور انھوں نے اپنے رسائل و تصانیف میں لکھا ہے۔ اب غور فرمائیے کہ ان اکابر کے رسائل اور اعتقادات بالکل اس کے مخالف ہیں۔ حضرت مولانا نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک بہت بڑی ضخیم کتاب تحریر فرمائی ہے، جو کہ مشہور بآبِ حیات ہے۔ اس میں کس

۱؎ یہ تصریح ان لوگوں کے لیے مقامِ عبرت ہے، جو محض اپنے موقف کی حمایت میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے خود ہی دوسرے اکابرِ دیوبند کے نام "المہند" کی تصدیق میں لکھ دیے تھے یا یہ کہ دوسرے اکابر نے "المہند" پر صرف اعتمادًا دستخط کر دیے تھے۔ عبارات خود نہ دیکھی تھیں۔ دیکھیے حضرت مفتی صاحب کس طرح واضح طور پر تصریح فرما رہے ہیں کہ میں نے تمام جوابات خود دیکھے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے مسلکی حمایت میں جھوٹ بولا ہے، انھوں نے جوابات خود ہرگز نہ دیکھے تھے، تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ع بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن۔

۲؎ اس سے مراد نجدیہ متاخرین ہیں، ورنہ متقدمین نجدیہ تو اجماع امت کے مخالف نہ تھے۔

زور شور سے حیاتِ نبوی کا اثبات کیا ہے اور مذہب اہل[۱] سنت الجماعت اور فضائلِ نبوت میں کس درجہ اور قوت کے دلائل درج فرمائے ہیں۔ مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ "ہدایۃ الشیعہ" اور رسالۂ "حج" وغیرہ میں بھی اس کی تصریح[۲] و تائید فرما رہے ہیں۔ چونکہ اس مسئلہ میں خصوصًا ان حضرات کی عبارتیں بہت طول طویل واقع ہو رہی ہیں اور متعدد رسالے اسی مضمون کے تفصیلاً و اجمالاً چھپے ہوئے مشہور ہیں اس لیے بخوفِ تطویل یہیں نقل نہیں کرتا ہوں۔ جس کا جی چاہے "آبِ حیات"، "ہدیۃ الشیعہ"، "اجوبۂ اربعین"، "لطائفِ قاسمیہ" و "ہدایۃ الشیعہ" و "زبدۃ المناسک" وغیرہا رسائل میں دیکھ لیوے۔ یہ ایک خاص مسئلہ ہے، جس میں وہابیہ نے علمائے حرمین کی مخالفت کی ہے اور بارہا جدال و نزاع کی نوبت آئی۔ اس مسئلہ میں اور مسئلۂ آئندہ کی وجہ سے وہاں وہابی سنی سے ممتاز[۳] ہوتا ہے۔"

(رجوم المدنیین ص ۴۸، ۴۹ مطبوعہ بمبئی جوب برقی پریس دہلی مصنفہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح)

"یہ روایت دوامِ حیات پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ دن رات میں کوئی گھڑی اور کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ اس سے خالی نہیں رہتا کہ آپ پر اندرونِ نماز اور بیرونِ نماز درود نہ بھیجا جاتا ہو۔ اس لیے دوامِ حیات لازم آئے گا۔"

(المکتوبات شیخ الاسلام جلد ۱ ص ۲۴۳، ۲۴۴ مطبوعہ اعظم گڑھ)

"محمد بن عبدالوہاب اور اس کے فرقہ سے ان حضرات (اکابر علمائے دیوبند)

---

[۱] اس سے معلوم ہوا کہ حیات النبی صلعم کا عقیدہ ضروریاتِ مذہب اہل سنت میں سے ہے، جو اس کا قائل نہیں، وہ دائرہ اہلِ سنت سے خارج ہے۔

[۲] اس سے معلوم ہوا کہ عقیدہ حیات النبی میں حضرت نانوتوی رح اور حضرت گنگوہی رح کے مابین کوئی اختلاف نہ تھا۔ دونوں بزرگوں کا عقیدہ ایک ہی تھا۔

[۳] اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلۂ حیات النبی کے اقرار سے ہی کسی کا سُنّی ہونا پہچانا جاتا ہے۔

کو دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وُہ عقائد و اقوال جو طائفۂ وہابیہ کے مشہور اور مابہ الامتیاز (بین اہل السنّۃ وبینہم) ہیں۔ ان کے خلاف ان حضرات کی تصانیف بھری ہوئی ہیں، وُہ وفاتِ ظاہری کے بعد انبیاء علیہم السّلام کی حیاتِ جسمانی اور بقاے "علاقہ بین الرّوح والجسم" کے مُنکر ہیں[1]۔ اور یہ حضرات صرف اس کے قائل ہی نہیں، بلکہ مُثبت[2] بھی ہیں اور بڑے زور شور سے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے متعدد رسائل اِس بارہ میں تصنیف فرما کر شائع کر چکے ہیں۔ رسالہ "آبِ حیات" نہایت مبسوط رسالہ خاص اِسی مسئلہ کے لیے لکھا گیا ہے[3]۔ نیز "ہدیۃ الشیعہ"، "اجوبہ اربعین" حصّہ دوم اور دیگر رسائل مطبوعہ مصنّفہ حضرت نانوتوی رح قدس اللّٰہ سرہ العزیز اِس مضمون سے بھرے ہوئے ہیں"۔ (نقشِ حیات جلد ا ص۱۰۳ مصنّفہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح)

"حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللّٰہ سرہ العزیز نے اس حضرت کی شانِ مبارک میں وُہ بلند پایہ مضامین ارشاد فرماتے ہیں، جن کے حریمِ معلّٰی تک جلیل القدر علماے اُمّت کا طائرِ فکر بھی پرواز نہیں کر سکتا تھا۔ رسالہ "آبِ حیات"، "قبلہ نما"، "تحذیر الناس"، "ہدیۃ الشیعہ"، "اجوبہ اربعین"، "قاسم العلوم"، "مناظرۂ عجیبہ" وغیرہ ایسے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں"۔ نقشِ حیات جلد ا ص۱۰۴

دس اکابرِ دیوبند قدس اللّٰہ اسرارھم کا بیان ختم ہوا۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

---

[1] حضرت کی اِس عبارت سے معلوم ہوا کہ حیاتِ جسمانی اور بقاءِ علاقہ "بین الرّوح والجسم" کے منکر اہلِ سُنّت میں سے نہیں اور وُہ دیوبندیت سے بھی خارج ہیں۔ [2] اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوبندیت صرف یہی نہیں کہ آں حضرت کے تعلق بین الروح والجسم کا اقرار کر لیا جائے بلکہ دیوبندی ہونے کے لیے اس کا مُثبت ہونا (خواہ تحقیقاً ہو خواہ تقلیداً) اور اِس عقیدے کو تسلیم کرانے کے لیے پوری طرح فکر و قوّت صرف کرنا ضروری ہے۔ حضرت کا یہ بیان ان لوگوں کے لیے پیامِ عبرت ہے، جو اِس تعلق رُوح وجسم کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر اس کے اثبات میں "مصلحۃً" خاموش ہیں۔ [3] معلوم ہوا کہ "آبِ حیات" لکھنے کی غرض محض ردِّ قفص ہی نہیں جیسے کہ بعض کا خیال ہے، بلکہ اصل مقصود عقیدۂ حیات النبی کا اثبات تھا۔

موجودین دامت برکاتہم:۔

(۱) صدر الافاضل، فخر الاماثل، جامع شریعت و طریقت حضرت العلامۃ الحاج الحافظ القاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند:۔

حضرت قاری صاحب لکھتے ہیں:۔

"مسئلۂ زیرِ بحث میں جہاں تک اپنے بزرگوں کی کتابوں، فتاوے، مقالات اور متوارث ذوق کا تعلق ہے، دیوبندیت تو یہی ہے کہ برزخ میں آنحضرت کو حیاتِ دنیوی کے ساتھ زندہ مانا جائے۔ کیونکہ دیوبندیت کی موجودہ جماعتی تشکیل قیامِ دارالعلوم سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی ابتدا حضرتِ اقدس حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی سرپرستی میں ان کے دو جلیل القدر خلفاء حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ سے ہوئی۔ ان تینوں کا مسلک بھی حیاتِ دنیوی (کہ اس عالمِ برزخ کی حیات اسی جسدِ اطہر میں ہے، جو اس دنیا میں تھا) ہے، پھر ان آخر الذکر دو بزرگوں کے تلامیذ مثل حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا احمد حسن امروہی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند وغیرہ وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک تھا، جو ان کے مطبوعہ فتاویٰ و مقالات میں محفوظ ہے۔"

"پھر ان اکابر کے تلامذہ مثل حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور دوسرے اساتذۂ دارالعلوم دیوبند وغیرہ وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے۔ یہی حضرات دیوبندیت کے اساطین کہلاتے

ہیں۔ اِس لیے دیوبندیت تو حیاتُ النّبیؐ کے بارے میں حیاتِ دُنیوی (باعتبارِ ابدانِ دُنیا) ہی ہے جو برزخ میں قائم ہے۔"

(الصدّیق ملتان شمارہ ۳۱ ماہ ربیع الاوّل ۱۳۷۵ھ)

"نحمدہٗ ونصلی، احقر اور احقر کے مشائخ کا مسلک وہی ہے، جو "المہنّد" وغیرہ میں بالتّفصیل مرقوم ہے۔ یعنی برزخ میں جناب رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور تمام انبیاء علیہم السّلام بجسدِ عنصری زندہ ہیں، جو حضرات اس کے خلاف ہیں وہ اِس مسئلہ میں دیوبند کے مسلک سے ہٹے ہوئے ہیں"۔

محمّد طیّب مدیر دارالعلوم دیوبند حال وارد ملتان[1]

پھر حضرت قاری صاحب ارشاد فرماتے ہیں:۔

"آبِ حیات" وہ کتاب ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ میں نے یہ کتاب اُستاد رحمۃ اللہ علیہ سے درسًا درسًا پڑھی۔ تب مصنّف کے مدارک پر مطلع ہُوا۔ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سے اِس واقعہ کا حوالہ دے کر عرض کیا تھا کہ مجھے یہ کتاب آپ پڑھا دیں، تو اُنھوں نے بایں ذہن و ذکاء فرمایا کہ میرے بس کی بات نہیں، تو ایسی کتاب ہم جیسے نالائقوں کے بس کی بات کیا ہوسکتی ہے؟

...... حاصل[2] یہ ہُوا کہ سرورِ عالمؐ ہر آن مشاہدۂ جمالِ الٰہی میں بھی مستغرق رہتے ہیں اور اُمّت کی طرف بھی آپؐ کی توجّہ ہر لمحہ مبذول رہتی ہے نہ یہ استغراق توجّہ میں مانع ہوتا ہے، نہ توجّہ استغراق میں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُمّت کا ایک عارفِ کامل حالتِ کشف میں اپنے محبُوب کے

---

[1] یہ اصل تحریر مدرسہ عربی خیرالمدارس ملتان میں موجود ہے۔ [2] جو شبہات منکرینِ حیات کی طرف سے حدیث "ما من احد یسلّم علیّ الا ردّ اللہ علیّ روحی" پر وارد کیے جاتے ہیں اُن کا ازالہ فرمانے اور مضمونِ حدیث پر نہایت نفیس بحث کرنے کے بعد حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم یہ بیان ارشاد فرماتے ہیں

جمالِ جہاں آراء کے دیدار سے مشرف ہوا، تو اُس نے سرورِ عالمؐ کو اس حال میں پایا ـــــ

ورأیتہٗ مستغرقاً علی حالۃ واحدۃ ...... متوجھاً الی الخلق لابسًا لباس العظمۃ ...... فاذا توجّہ الیہ انسان بجھد ھمّتہ ولا اری الانسان تعالی الھمۃ فقط بل کل ذی کبد یشتاق الی شیٔ ویتوجہ الیہ بقصدہٖ و شوقہ فانہ یتدلی الیہ... ..... ورأیتہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم ینشرح انشراحًا عظیمًا لمن صلی علیہ وسلّم ومدحہ۔

"میں نے سرورِ عالمؐ کو اس حال میں دیکھا کہ آپؐ بندگانِ الٰہی کی طرف متوجہ تھے۔ پوری توجہ کے ساتھ عظمت و بڑائی کا لباس آپؐ کے زیبِ تن تھا۔ جب کوئی خدا کا بندہ ذوق و شوق کے ساتھ آپؐ کی طرف متوجہ ہوا، تو میں نے دیکھا کہ سرورِ عالمؐ اُس سے قریب ہو گئے اور میں نے دیکھا کہ جس شخص نے حضورؐ پر درود و سلام بھیجا اور آپؐ کی تعریف کی تو آپؐ اُس سے بہت زیادہ خوش ہوئے۔"

یہ کشف ہے ان کا جو عارفوں کے امام اور محدثوں کے سردار تھے یعنی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، جسے انھوں نے اپنی مشہور کتاب "فیوض الحرمین"[1] میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم و احکم۔

(مضمون حضرت العلامہ القاری محمد طیب صاحب ماہنامہ دارالعلوم دیوبند) ربیع الاول ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۳ء

---

[1] فیوض الحرمین ص۱۳ - بحریہ بھی فرماتے ہیں: ما توجّہت قط قبرہ علیہ الصلوٰۃ والسلام الا ورأیتہ حاضراً ظاھراً اما بان اتمثل بصور روحی فرأیتہ علی ما ھو واما ان تأثرت نفسی منہ تاثراً۔ (فیوض الحرمین ص۳۳، مطبوعہ دیوبند)

۲ - زبدۃ المحدثین، شمس العارفین، شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث مدرسۂ عالیہ مظاہر العلوم سہارنپور :-

"مکرم محترم مدفیوضکم بعد سلام مسنون - نہایت طویل گرامی نامہ پہنچا - آپ نے ایسے شخص کو مخاطب بنایا جو نہ تو مفتی نہ مولوی - اس ناکارہ کی حقیقت ایک نقل نویس کی ہے - اس سے زیادہ کچھ نہیں، جو اکابر و اسلاف کی کلام میں ملتا ہے اسی کو ادھر اُدھر نقل کرتا رہتا ہوں، اسی کا نام شرح موطا ہے - یہی سب تبلیغی رسائل کی حقیقت ہے - آپ نے تحریر فرمایا کہ دونوں طرف کے کچھ لوگ میری تحریر کو قبول کرنے کو آمادہ ہیں، موجب تعجب ہے - جن حضرات کو اس ناکارہ کے جملہ اکابر حضرت گنگوہی قدس سرہ سے لے کر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ تک کی تحریرات قابلِ قبول نہیں ہیں وہ اس ناکارہ کی تحریر کو کیا قبول کر سکتے ہیں - بہرحال یہ ناکارہ ان اکابر کا بالکل متبع ہے - ان کے اس صاف ارشادات اور تحریرات کے بعد جس پر حضرت سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، حضرت رائپوری، حضرت تھانوی قدس اللہ اسرارہم نے بلا کسی اجمال کے "ھذا معتقدنا و معتقد مشائخنا" لکھا ہے کیا کوئی گنجائش ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہا جا سکے - جو نصوص آپ نے حمات کے متعلق لکھی ہیں، اُن سے کون پڑھا لکھا انکار کر سکتا ہے؟ بالخصوص جن حضرات کی راتیں ہمیشہ تلاوتِ قرآن اور دن ساری عمر تدریسِ بخاری شریف وغیرہ کتبِ حدیث میں گزر رہیں، ان کو کبھی بھی پتہ نہ چلا کہ قرآن پاک کی آیات میں کیا وارد ہوا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں کیا فرمایا - ان میں سے حضرت رائپوری قدس سرہ کے علاوہ کونسا ایسا ہے جس کی عمر کا معتدبہ حصہ تدریسِ حدیث میں نہیں گزرا اور حضرت اقدس رائپوری قدس سرہ کے علوم و معارف کو سننے والے ابھی تک دنیا میں بکثرت موجود ہیں - مگر ان میں سے کسی کو بھی نہ تو قرآن پاک کی

کسی آیت کا پتہ چلا نہ حدیثِ پاک میں کوئی ممات والی روایت ان کی نظر سے گزری۔ یہ ناکارہ اپنے ان اکابر کے متعلق وہی عقیدہ رکھتا ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے اکابر یعنی صحابہ کرامؓ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ "فانہم[۱] علیٰ علم وقفوا وببصر نافذ کفوا وہم علی کشف الامور کانوا اقوی وبفضل ما کانوا فیہ اولیٰ فما دونہم من مقصر وما فوقہم من محسر وقد قصر قوم دونہم فجفوا وطمح عنہم اقوام فغلوا وانہم بین ذلک لعلیٰ ھدًی مستقیم"۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دورِ فساد میں آدمی اس وقت تک محقق نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کہ سلفِ صالحین کے خلاف کوئی نئی ایجاد نہ کرے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی پیش گوئی "ان من ورائکم فتنا یکثر فیہا المال ویفتح فیہا القرآن حتّٰی یاخذہٗ - المومن والمنافق والرجل والمرأۃ والکبیر والصغیر والعبد والحر فیوشک قائل ان یقول ما للناس لا یتبعونی وقد قرأت القرآن ماھم بمتبعی حتی ابتدع لھم غیرہٗ فایاکم و ما ابتدع الخ لہٰذا یہ ناکارہ تو حذو النعل بالنعل ان حضرات کا جامد متبع ہے اور اس ناکارہ کی تحریر میں کوئی لفظ بھی ان اکابر کی تحقیق کے خلاف ہے تو وہ لغو ہے، ناقابلِ التفات ہے، مردود ہے۔ اس سب کے بعد گرامی نامہ کے مستفسرات کے متعلق اپنا خیال یہ ہے کہ جیسا حیات کے درجات متفاوت ہیں جس کا اعتراف یہ حضرات خود بھی کرتے ہیں، جیسا کہ آپ نے لکھا۔ اسی طرح ممات کے بھی درجات مختلف ہیں۔ نوم پر بھی احادیثِ صحیحہ صریحہ میں موت کا اطلاق کیا گیا ہے اور جاگنے کی دعاؤں میں بکثرت ہے۔ "الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا" وارد ہے قرآن پاک میں "اللہ یتوفی الانفس حین موتہا" الآیہ

---

[۱] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۷ - کتاب السنۃ

میں نوم پر وفات کا اطلاق کیا گیا ۔ "لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ" میں موت کی نفی کی گئی وغیرہ وغیرہ ۔ لہٰذا جن نصوص میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ و سلّم پر موت کا اطلاق کیا گیا ۔ ان میں سے کوئی سی بھی حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ یا اکابرِ دیوبند یا مہنّد کے خلاف نہیں ہے ۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے خطبہ میں بھی مری موت مراد ہے، جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کی شایانِ شان ہے ۔ خود حضرتِ عمرؓ کے تفصیلی اقوال جو اس سلسلہ میں نقل کیے گئے ہیں، اس کی واضح تائید کرتے ہیں ۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ کسی نوعِ ممات کے بھی قائل نہ تھے چنانچہ اُن کا ارشاد " ان رجالاً من المنافقین یزعمون ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم توفی واللہ ما مات ولکنّ ذھب الی ربہ کما ذھب موسی ابن عمران واللہ لیرجعنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کما رجع موسٰی فلیقطعن ایدی رجالٍ وارجلھم زعموا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مات " بیہقی کی روایت سے خود حضرتِ عمرؓ کا یہ مقولہ نقل کیا گیا کہ وہ آیت وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطًا الآیۃ کے متعلق فرماتے ہیں :

" واللہ ان کنت اظن انہ صلی اللہ علیہ وسلّم سیبقٰی فی امتہٖ حتی یشھد علیہ بآخر اعمالھا وانہ ھو الذی حملنی علٰی ان قلت ما قلت " لہٰذا شیخینؓ کے مکالمہ کو موجودہ مسئلہ متنازعہ سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس لیے کہ حضرتِ عمرؓ موت کا بالکلیہ انکار فرماتے تھے اور سمجھتے تھے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم ابھی واپس تشریف لے آئیں گے ۔ اس کے لحاظ سے حضرت صدیقِ اکبرؓ کا ردّ بالکل صحیح اور واضح ہے کہ بنوعٍ من الموت سے کسی کو بھی انکار نہیں ۔ انکار صرف موت بجمیع الوجوہ سے ہے کہ نوعِ خاص من الحیوٰۃ فی الجسد الاطھر باقی ہے ۔ تعجب ہے کہ یہ حضرات اجسادِ انبیاء کے بقاء کے قائل

ہیں۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ لیکن ان اجساد میں اگر کسی نوع کی بھی حیات نہ مانی جائے، تو یہ حدیثِ پاک ہی مہمل بن جائے گی۔ اس لئے کہ حضورؐ کا پاک ارشاد اس حدیثِ پاک میں یہ ہے: "اکثروا علیّ من الصلوٰۃ فیہ فان صلوٰتکم معروضۃ علیّ"۔ اس پر صحابہ کرامؓ کو اشکال ہوتا ہے "قالوا یا رسول اللہ کیف تعرض وقد بلیت"۔ اس پر حضورؐ جواب فرماتے ہیں: ان اللہ حرم الخ آپ ہی غور کریں کہ اگر ان پاک اجساد میں کوئی نوع حیوٰۃ کی نہیں، تو حضورؐ کا یہ پاک ارشاد صحابہؓ کے اشکال "کیف تعرض" کا جواب کیسے بن گیا۔ روایت بھی صحیح ابن حبان کی ہے اور حاکم نے اس کو علیٰ شرط البخاری بتلایا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے اقرار کیا۔ ایک چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ باجماعِ اُمت قبرِ اطہر کا وہ حصہ جو جسدِ اطہر سے متصل ہے۔ کعبہ شریف بلکہ عرشِ معلّٰی سے بھی افضل ہے۔ کیا یہ فضیلت صرف اس جسدِ اطہر کی ہے، جس کے ساتھ کبھی روح کا تعلق رہ چکا ہے، اب نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر موئے مبارک جو جسدِ اطہر سے جدا ہو چکے ہیں، اُن کا بھی یہی حال ہوتا، بلکہ لباسِ مبارک جو کبھی جسدِ اطہر پر پڑ چکا ہے اس کا بھی یہی حکم ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال یہ ناکارہ تو اکابرِ دیوبند قدس اللہ اسرارہم کا ہمہ تن متبع ہے اور ان سب حضرات کا متفقہ فیصلہ "المہند" میں بلا کسی اجمال کے تحریر ہے۔ اس سے آپ کے جملہ سوالات کا جواب واضح ہو گیا۔ مختصر نمبر وار بھی عرض ہے لیکن آپ نے صفحہ ۵ پر سوالات کو کے گرامی نامہ ختم کرکے ص۵ پر پھر مختلف سوالات عبارت کے تغیر کے ساتھ درج کر دیے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہرحال ہر دو کے جواب حسبِ ذیل ہیں:-

ص۵ (۱) اجسادِ انبیاءِ کرام علیہم السلام میں ایک خاص نوع کی حیات ہے۔

(۲) یہ ظاہر ہے کہ حیوٰۃ تو روح ہی کے تعلق سے ہوتی ہے۔ بغیر تعلقِ روح

کے حیاۃ کا کیا مطلب ؟

۳۔ اگر ایسی حیاۃ ہوتی جو ہر ذرۂ کائنات میں ہوتی ہے تو پھر انبیاءؑ کی کیا تخصیص ہی
علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں[1] : "نحن نؤمن ونصدق بانہ صلی اللہ علیہ
وسلم حی یرزق فی قبرہ"

۴۔ ایک دیوبندی سے یہ سوال کہ علماء دیوبند کا یہ قول قابلِ اقتدا ہے یا نہیں
بے محل ہے۔ علامہ سخاویؒ تو امام بیہقیؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں[2] "قال
البیہقی وفی حدیث سعید ابن المسیب عن ابی ہریرۃؓ انہ
لقیہم ببیت المقدس وفی حدیث ابی ذرؓ ومالک بن صعصعۃ
فی قصۃ المعراج انہ لقیہم فی جماعۃ من الانبیاء بالسموات
فکلمہم وکلموہ وکل ذلک صحیح لا یخالف بعضہم بعضاً
فقد یری موسیٰ علیہ السلام قائماً یصلی فی قبرہ ثم یسری
بموسیٰ وغیرہ الی بیت المقدس کما اسری بنبینا فیراہم فیہ ثم
یعرج بہم الی السموات کما عرج بنبینا فیراہم فیہا کما اخبر قال
وحلولہم فی اوقات مختلفۃ لمواضع مختلفات جائز فی العقل
کما ورد بہ خبر الصادق وفی کل ذلک دلالۃ علی حیوتہم" یہ تو
بہت ہی صاف ہے لیکن اگر یہ حضرات اپنی قبروں میں روح مع الجسد
ہوں اور دوسری مواضع میں روح متمثل ہو۔ جیسا کہ بعض نے فرمایا تو اس
میں بھی کوئی مانع نہیں۔

۵۔ جو شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ اطہر کے پاس کھڑا ہو کر درود
پڑھے، حضورِ اقدس اُس کو سنتے ہیں۔ "من صلی علی عند قبری سمعتہ"

---

[1] القول البدیع ص۱۲۵ [2] القول البدیع ص۱۲۶ [3] القول البدیع ص۱۱۶

نص صریح ہے۔ علامہ سخاویؒ نے حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا ہے "سندہٗ جید"۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ مستقل قاصد مدینہ پاک بھیجا کرتے تھے تاکہ قبرِ اطہر پر سلام پہنچائے۔ اگر کوئی فرق نہیں تھا، تو ان کا یہ فعل عبث تھا۔ فقط۔

اس کے بعد صفحہ ۲۷ پر پھر مکرر سوالات درج ہیں نہ معلوم کیوں؟

ء۱ یہ اُوپر بیان ہو چکا کہ ان سب حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد میں ایک خاص نوع حیٰوۃ کی ہے۔

ء۲ یہ سوال بھی مکرر ہے اور جواب بھی وہی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اجسادِ انبیاءؑ میں ایک خاص نوع حیٰوۃ کی ہے۔

ء۳ مجھے حضرتِ نانوتویؒ اور حضرت گنگوہی قدس سرہما کے مسلک میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ مہند میں حضرت سہارنپوریؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت رائپوریؒ وغیرہ کا یہ ارشاد "ھٰذا معتقدنا و معتقد مشائخنا" واضح ہے۔ اس لیے کہ ان تینوں حضراتؒ کے شیخ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی اعظم دار العلوم نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے "انک میت" الآیۃ کے اشکال کا جو جواب نقل کیا ہے، وہ تو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی تعبیر سے بھی اونچا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ موت سب کو شامل ہے، مگر انبیاء کرام کی ارواح مشاہدۂ جمال و جلالِ حق تعالیٰ شانہٗ، و تقابلِ آفتابِ وجودِ باری تعالیٰ سے اس درجہ پر پہنچ جاتی ہیں کہ اجزاءِ بدن پر ان کا یہ اثر ہوتا ہے کہ تمام بدن حکمِ روح پیدا کرے

---

۱ دیکھو شفاء السقام صـ۱۴۲۔

لیتا ہے۔ اور تمام جسم ان کا عینِ ادراک اور عینِ حیات ہو جاتا ہے۔ اور یہ حیات دوسری قسم کی ہوتی ہے اور اس تحقیق سے نکتہ ان اللہ حرّم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء بھی ظاہر ہو جاتا ہے الخ آپ بھی غور کیجیے کہ ہم ناواقف ان واصلین کے علوم تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔

۴۔ معلوم نہیں ایک ہی سوال کو بار بار مختلف عنوانات سے لکھنے میں کیا مقصد ہے۔ یقیناً مہنّد میں جو ہے صحیح ہے۔ شہابِ ثاقب اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔

۵۔ حضرت رائپوری دام مجدہم بار بار تبلیغی اور تحریری ارشاد فرما چکے ہیں کہ میرا مسلک وہی ہے جو اکابرِ دیوبند کا ہے۔ اس وقت بھی یہی فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ بے کار وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں تو ۸۰ سال سے متجاوز ہو کر من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئا میں داخل ہو گیا ہوں۔ اور بھی کسرِ نفسی کے الفاظ ارشاد فرمائے جن کا نقل دشوار ہے کہ میں ان حضراتِ اکابرؒ کے مقابلے میں کیا چیز ہوں۔

۶۔ اگر روایت صحیح نہ کہنے والے حافظ ابن حجرؒ سے اونچے ہیں، تو ان کے قول پر غور کیا جا سکتا ہے۔

(نوٹ) علامہ ذہبیؒ کا قول جرح و تعدیل میں معتبر ہے۔ لیکن ہر شخص کے قول کو دیگر اہلِ فن کے اقوال کے لحاظ سے دیکھا جائے گا۔ اگر علامہ ذہبیؒ کی جرح و تعدیل دوسرے اکابر کے خلاف ہوگی، تو غور کیا جائے گا، ورنہ یقیناً معتبر ہے۔ فقط

آخر میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ یہ دقیق مسائل عوام کی عقول سے اونچے ہیں۔ اردو رسائل و اشتہارات میں لانا ان میں بحثیں کرنا نہایت ناموزوں ہے

لایدرک الصبی مدارک العالم ہر دو فریق سے درخواست ہے کہ اس بحث کا سلسلہ جلد از جلد بند کر دیا جائے۔ فقط والسلام

زکریا بقلم خود۔ مظاہر علوم سہارنپور

۲۵ ج ۲ ۸۱ھ

۳۔ فخر المحدثین والفقہاء استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی دامت برکاتہم شیخ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ۔

من ینکر حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ ——— کان فوادہ فارغاً من حبہ و عقلہ خالیاً من لبہ۔	جو شخص حضور اکرمؐ کے اپنی قبر شریف میں زندہ ہونے کا انکار کرتا ہے۔ اس کا دل حضورؐ کی محبت سے فارغ ہے اور اس کی عقل بصیرت سے خالی ہے۔

اعلاء السنن جلد ۱۰ ص ۳۳۹

۴۔ زبدۃ الفقہاء بدر الادباء حضرت مولانا الحاج مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم۔ سابق مفتی اعظم دار العلوم دیوبند:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ رسالہ "رحمتِ کائنات" مصنفہ مولانا محمد زاہد الحسینی تقریباً پورا مطالعہ کیا۔ حیاتِ انبیاء علیہم السلام کے مسئلہ پر نہایت نافع اور مفید تحقیقات جمہور اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ کے مطابق جمع کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرماویں۔

مسئلہ کے متعلق تحقیقات کے ضمن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تا قیامت باقی رہنے والے فیوض و برکات اور آثارِ حیات کا ذکر آیا ہے۔ وہ خود ایک نہایت مفید مضمون ہے جس سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت مومن کے قلب میں بڑھتی ہے جو سرمایۂ سعادتِ دنیا و آخرت ہے (رزقنا اللہ تعالیٰ) مجھے بھی

بحمد اللہ اس سے بڑا نفع پہنچا۔ دل سے دعا نکلی۔ جمہور علماءِ امت کا عقیدہ اس مسئلہ میں یہی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام برزخ میں جسدِ عنصری کے ساتھ زندہ ہیں، ان کی حیات برزخی صرف روحانی نہیں بلکہ جسمانی حیات ہے جو حیاتِ دنیوی کے بالکل مماثل ہے بجز اس کے کہ وہ احکام کے مکلف نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ آثار بعض دنیاوی احکام میں بھی باقی ہیں، مثلاً میراث کا تقسیم نہ ہونا۔ ازواجِ مطہرات سے بعدِ وفات کسی کا نکاح جائز نہ ہونا۔ متقدمین میں امام بیہقیؒ کا اور متاخرین میں شیخ جلال الدین سیوطیؒ کا مستقل رسالہ اس مسئلہ کی توضیح کے لیے کافی ہے جن میں روایاتِ حدیث پوری تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ بیہقیؒ نے فرمایا ہے ولحیاۃ الانبیاء بعد موتھم شواھد من الاحادیث الصحیحۃ "اس میں تصریح ہے کہ موت کے بعد ان کی حیات احادیث صحیح سے ثابت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ موت صرف جسم پر آتی ہے، روح پر نہیں۔ اس لیے حیاتِ بعد الموت کو صرف روحانی کہنے کے کوئی معنی نہیں اور "شفاء الاسقام" میں امام حدیث وفقہ تقی الدین سبکیؒ نے اپنی کتاب کا نواں باب اسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے لکھا۔ اس میں انبیاء علیہم السلام کے لیے بعد وفات کے حیات جسمانی حقیقی ثابت کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ:-

وقد ذکرناہ من جماعتہ من العلماء وشھد لہ صلوۃ موسیٰ علیہ السلام فی قبرہ فان الصلوۃ یستدعی جسداً معھا وکذالک الصفات المذکورۃ فی الانبیاء لیلۃ الاسراء کلھا صفات الاجسام ولا یلزم من کونھا حیاۃ حقیقۃً ان یکون الابدان معھا کما کانت فی الدنیا من الاحتیاج الی الطعام والشراب والامتناع عن النفوذ فی الحجاب الکثیف وغیر ذالک من الصفات الاجسام التی نشاھدھا بل قد یکون لھا

حکماً آخر فلیس فی العقل ما یمنع من اثبات الحیاۃ الحقیقیۃ بھم۔
(شفاء الاسقام من السبکی رح)

اس کے بعد شہداء کی حیاتِ برزخی پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:۔

فلم یبق الا انہا حیاۃ حقیقیۃ الآن وان الشہداء احیاء حقیقۃً وھو قول جمہور العلماء لکن ھل ذلک للروح فقط او للجسد معہا فیہ قولان۔

اس کے بعد اس قولِ ثانی کو ترجیح دی کہ یہ حیاتِ حقیقی صرف رُوح کے لیے نہیں بلکہ جسد کے لیے بھی ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ جب عام شہداءِ اُمّت کے لیے برزخ میں حیاتِ حقیقی جسمانی ثابت ہوئی تو انبیاء کی حیات کچھ اُن سے اعلیٰ واقویٰ ہی ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات بعد الموت حقیقی جسمانی مثلِ حیاتِ دُنیوی کے ہے۔ جمہور علماءِ اُمّت کا یہی عقیدہ ہے۔ اور یہی عقیدہ میرا اور سب بزرگانِ دیوبند کا ہے۔

(۳، ۴) مسئلۂ مذکورۃ الصدر کی تحقیق میں یہ بھی آچکا ہے کہ صرف حیاتِ رُوحانی کا قول جمہور علماءِ اُمّت کے خلاف ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دیوبندیت کوئی مستقل مذہب نہیں، اتباعِ سلف وجمہور اہلِ سُنّت والجماعت ہی کا نام دیوبندیت ہے جو عقیدہ جمہور اہلِ سُنّت والجماعت کے خلاف ہے وہ دیوبند کے بھی ضرور خلاف ہے۔

بندہ محمد شفیع عفی عنہ دارالعلوم کراچی ۱۴
۱۳ ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۸ھ

۵ - محدّثِ کبیر، فقیہِ شہیر جامعِ معقول و منقول حضرت مولانا الحاج مفتی مہدی حسن صاحب دامت برکاتہم، مفتیٔ اعظم دار العلوم دیوبند:-

الجواب

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے مزارِ مبارک میں بجسدہٖ موجود ہیں اور حیات ہیں۔ آپ کے مزارِ مبارک کے پاس کھڑے ہو کر جو سلام کرتا اور درود پڑھتا ہے آپ خود سنتے اور سلام کا جواب دیتے ہیں۔ ہمارے کان نہیں کہ ہم سنیں۔ آپ اپنے مزار میں حیات ہیں۔ مزارِ مبارک کے ساتھ آپ کا خصوصی تعلق بجسدہٖ و روحہٖ ہے۔

جو اس کے خلاف کہتا ہے غلط کہتا ہے، وہ بدعتی ہے، خراب عقیدے والا ہے۔ اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔ یہ عقیدہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء - (الحدیث) وعن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علیّ من بعید اعلمتہ رواہ ابو الشیخ وسندہ جید ا- (القول البدیع) عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الانبیاء صلوٰۃ اللہ علیہم احیاء فی قبورہم یصلون رواہ ابن عدی والبیہقی وغیرہما۔ (شفاء الاسقام ص ۱۳۴)

تین حدیثیں نقل کر دی ہیں۔ اس باب میں بکثرت احادیث وارد ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو انکار کرتا ہے، بدعتی اور خارج اہل سنت والجماعت ہے۔ غرض پڑھنے والے کو ثواب بھی پہنچتا ہے اور مزارِ مبارک کے قریب پڑھنے سے آپ سنتے بھی ہیں اور اپنے مزارِ مبارک میں بجسدہٖ موجود ہیں اور حیات ہیں۔

کتبہٗ، السید مہدی حسن، مفتی دار العلوم دیوبند

۱۳ ۵/۷۶ ھ

۵۰۳ الف الجواب

اہلِ سُنّت والجماعت متفق ہیں کہ انبیاءؑ اپنی قبور میں حیات ہیں۔ ان کی ارواح کو ان کے اجسام مطہرہ سے خصوصی تعلق ہے۔ اس خصوصیت میں مخلوق میں سے کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ ان کی قبور پر سلام پڑھا جائے تو وہ خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں:۔

قال الشیخ الکبیر ابو عبداللہ القرشی سافرت الی الشام فلما وصلت الی قریب ضریح الخلیل علیہ وعلی نبیّنا افضل الصلٰوۃ والسّلام تلقانی فقلت یا رسول اجعل ضیافتی عندک الدعاء لاھل مصر فدعا لھم ففرج اللہ عنھم فقال الیافعی نقولہ تلقانی الخلیل قول حق لا ینکرہ الاجاھل بمعرفۃ ما یرد علیھم من الاحوال التی یشاھدون فیھا ملکوت السمٰوٰت والارض وینظرون الانبیاء احیاء ردت الیھم ارواحھم بعد ما قبضوا واذن لھم فی الخروج من قبورھم والتصرف فی الملکوت العلوی والسفلی الخ (الفتاوی الحدیثیہ)

ویمثل صورتہ الکریمۃ السھیۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کانہ نائم فی لحدہ عالم بہ یسمع کلامہ قال صلی اللہ علیہ وسلم من صلّی علیّ عند قبری سمعتہ" (الاختیار شرح المختار ص ۱۷۴ ج ۱)

ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فداہ امّی و ابی اپنے مزارِ مبارک میں اپنے جسدِ اطہر کے ساتھ حیات ہیں جو اہل سنّت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ زائر کے صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ اس لیے زید کا خیال صحیح نہیں ہے۔ بکر کا قول اور اس کا عقیدہ صحیح اور اہلِ سنّت والجماعت کے مطابق ہے اور کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے۔ مواہب لدنیہ، شرح زرقانی، انباء الاذکیاء

الخصائص الکبرٰی۔ شرح اللباب۔ شفاء السقام وغیرہا ذالک من الکتب۔

بے شک اس عقیدے کے سلسلے میں زید اہلِ سنّت کے عقیدے سے خارج ہے کہ یہ اس کا عقیدہ اہلِ سنّت والجماعت کے خلاف ہے۔

سید مہدی حسن مفتی دار العلوم دیوبند

۲۵ ⁵/۷۸ ھج

۶۔ رأس الاتقیاء، استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدّین غور غشتی دامت برکاتہم، خلیفۂ اعظم حضرت مولانا الشیخ حسین علیؒ واں بھچروی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام اولادِ آدم کو موت کا پیالہ پینا ہے کلّ نفسٍ ذائقۃ الموت اور انّک میّت وانّہم میّتون۔ کلّ من علیہا فان۔ اعلانِ خداوندی سے تمام بنی آدم خواہ عام ہوں یا پیغمبر ہوں ضرور ایک وقت مرتے ہیں۔ اس کے ساتھ موت کے بعد بھی انسان میں ایک نوعِ حیات موجود رہتی ہے جس سے وہ ثواب اور عذاب سمجھتا ہے۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ میّت کو چارپائی پر قبرستان لے جاتے وقت اگر مومن ہے تو "قدّمونی۔ قدّمونی" "مجھے جلد پہنچا دو" کہتا ہے اور اگر نافرمان اور کافر ہے تو کہتا ہے کہ "اے مجھے ہلاکت ہو۔ مجھے کہاں لے جا رہے ہو"۔ قبر میں سوالِ منکر نکیر۔ میّت سے دفن کے بعد لوگوں کے واپسی کے وقت جوتوں کا آواز سننا۔ قبر میں عذاب اور ثواب۔ یہ دلیل ہے کہ موت کے بعد بھی انسان میں ایک قسم کی حیات موجود رہتی ہے۔ شہداء کے حق میں قرآن کا اعلان "احیاء" "حیاتِ ثبت" کی دلیل ہے۔ اسی حقیقت کے ساتھ سردارِ انبیاء خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم قبرِ شریف میں زندہ ہیں اور جو حیات اُن کی

شان کے مناسب ہے، اللہ نے قبر میں وہ حیات ان کو دی ہے، جسدِ اطہر قبر شریف میں محفوظ ہے۔ مٹی کوئی اثر جسدِ اطہر پر نہیں کر سکتی۔ اگر قبر کے پاس کوئی مسلمان درود شریف جہراً سلام ڈالے، تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں اور سلام کا جواب دیتے ہیں اور اگر کوئی دور سے درود شریف پڑھے، تو فرشتے رسولِ اکرم کے پاس پہنچاتے ہیں۔

میں اس مسئلہ کو حق اور صحیح سمجھتا ہوں۔ احادیثِ شریف، فقہائے عظام، سلف صالحین سے بھی اس مسئلہ کی حقانیت اور صحت ثابت ہے۔

میں نے مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلے کا کبھی اختلاف نہیں سنا اور نہ ہی میں نے کبھی اُن سے یہ پوچھا تھا، یہ تو ایک اہلِ سنت والجماعت کا متفقہ حق مسئلہ ہے۔

مسکین نصیر الدین غورغشتوی ؒ

۷۔ **بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، مجاہدِ کبیر شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری دامت برکاتہم۔**

"انبیاء علیہم السلام کی حیات فی البرزخ کے بارے میں میرا عقیدہ وہی ہے جو اکابر دیوبند کا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں اسی جسدِ عنصری سے زندہ ہیں، جو اس دنیا میں تھا۔ وہ حیات باعتبارِ ابدانِ دنیوی دنیوی بھی ہے اور باعتبارِ عالمِ برزخ برزخی بھی ہے انبیائے کرام کا ابدانِ دنیوی کے ساتھ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہونا اہلِ سنت والجماعت کا متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے۔ ہمارے اکابرِ دیوبند نے اس پر مفصل اور مدلل ارشادات ثبت فرمائے ہیں۔

جہاں تک مجھے علم ہے۔ یہ مسئلہ اکابرِ دیوبند میں کبھی مختلف فیہ نہیں رہا۔ میرے خیال میں ہر صاحبِ بصیرت اس عقیدہ حیات النبی کا منکر نہیں ہو سکتا۔ جن کی باطن کی آنکھیں کھلی ہیں۔ ان کے نزدیک تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روضۂ اطہر کی حیات بدیہیات میں سے ہے۔

احقر الانام احمد علی عفی عنہ

۸ - رأس الاتقیاء اسوۃ الصلحاء شیخ المشائخ حضرت مولانا الشاہ عبدالقادر رائپوری دامت برکاتہم

۱- "میرا مسلک وہی ہے، جو اکابرِ دیوبند کا ہے۔ یہ لوگ بے کار وقت ضائع کر رہے ہیں۔ (ارشاد حضرت رائپوری بہ تحریر حضرت شیخ الحدیث کاندھلوی)

۹ - دارالافتاء مدرسہ عربیہ مفتی کفایت اللہ، بقلم شیخ الحدیث والفقہ علامہ محمد عبدالغنی دامت برکاتہم۔

الجواب

صریح صحیح اور قوی متفق علیہ حدیث میں ہے: الانبیاء احیاء فی قبورہم۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جذب القلوب اور شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ جمہور علماء اہلِ سنت نے تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں جو بقعہائے نور اور دریچہائے جنت ہیں، حقیقتاً زندہ ہیں۔ ان کو وہاں سے کہیں دوسری جگہ نقل نہیں کیا جاتا الا فی معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں: حیاتِ انبیاء متفق علیہ ہست۔ ہیچ کس را درو خلافے نیست۔ حیاتِ جسمانی دنیاوی حقیقی نہ حیات معنوی روحانی چنانکہ شہدا را است اور حضرت محدث گنگوہیؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں کئی جگہ لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کو خلاف نہیں اور مزار مبارک کے پاس استشفاع بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بالاتفاق سنتے ہیں۔ اس استشفاع اور طلب دعا جناب باری تعالیٰ میں کسی کو اختلاف نہیں۔

الحاصل حیاتِ انبیاء فی القبور کا عقیدہ ایک اجماعی عقیدہ ہے۔ اس کا انکار اجماع کا انکار ہے اور سخت بدعتِ اعتقادی کا ارتکاب ہے۔ بہرحال اگر کسی نے لاعلمی کی وجہ سے انکار کیا، تو جہالت نہ صرف واجب الاجتناب ہے اور اگر احادیث کثیرہ اور اجماعِ امت کو رد کرتے ہوئے انکار کیا تو اس بدعتی عقیدہ ضلالہ سے توبہ واجب ہے۔ فقط

محمد عبدالغنی غفرلہ مدرسہ امینیہ دہلی ۲۷ جون ۱۹۵۹ء

صورة ما كتبه أكابر العلماء وجهابذة الفضلاء

ممن تولى التدريس والافتاء

مسئلہ حیاتُ النبیؐ

میں

اکابرِ دیوبند کا مسلک، اکابرِ دیوبند کا متفقہ اعلان

حضرت اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اکابر دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ وفات کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کے ابدان مقدسہ بعینہٖ محفوظ ہیں اور جسدِ عنصری کے ساتھ عالم برزخ میں ان کو حیات حاصل ہے اور حیاتِ دنیوی کے مماثل ہے صرف یہ ہے کہ احکام شرعیہ کے وہ مکلف نہیں ہیں لیکن وہ نماز بھی پڑھتے ہیں اور روضۂ اقدس میں جو درود پڑھا جائے بلا واسطہ سنتے ہیں اور یہی جمہور محدثین اور متکلمین اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے۔

اکابرِ دیوبند کے مختلف رسائل میں بہ تصریحات موجود ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تو مستقل تصنیف حیاتِ انبیاء "بہ آبِ حیات" کے نام سے موجود ہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ارشد خلفاء میں سے ہیں۔ ان کا رسالہ "المهند علی المفند" بھی اہلِ انصاف و اہلِ بصیرت کے لیے کافی ہے اب جو اس مسلک کے خلاف دعوے کرے اتنی بات یقینی ہے کہ ان کا اکابر دیوبند کے مسلک سے کوئی واسطہ نہیں۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ
مدرسہ اسلامیہ عربیہ کراچی نمبر ۵

عبد الحق عفی عنہ
مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ

(مفتی) محمد صادق عفا اللہ عنہ
سابق ناظم محکمہ امور مذہبیہ بہاولپور

محمد رسول خان عفا اللہ عنہ
جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور

شمس الحق عفا اللہ عنہ
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

(مفتی) محمد حسن
مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ۔ شیخ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ
(ٹنڈو الہ یار سندھ)

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
دار العلوم کراچی

مسئلہ جمع القرآن

حضرت مولٰنا علامہ خالد محمود صاحب سیالکوٹی

فاضل دیوبند ایم اے عربی، ایم اے فارسی و ایم اے

اسلامیات مصنف "مقام حیات" نے مسئلہ جمع القران

کے چند پوشیدہ گوشوں کو اپنی زیر طبع تالیف میں

بے نقاب کیا ہے۔

تفصیلات کا انتظار فرمایئے

لطف اللہ خان